www.urducouncil.nic.in
قیمت: ₹10/-

آدمی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اپریل 2018

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا

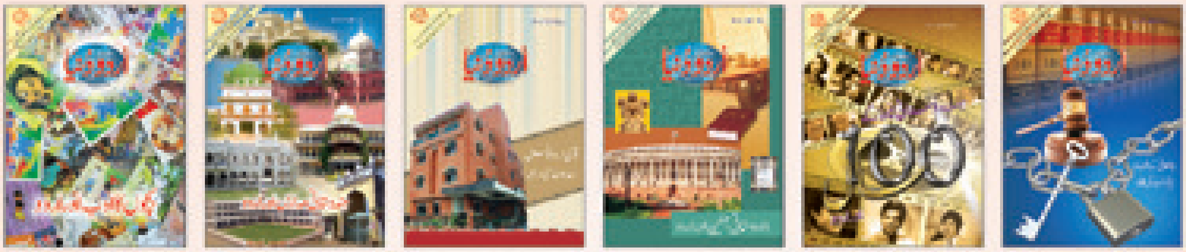

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھئے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066 فون: 26109746، فیکس: 26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

اردو آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے | جلد: 2 شمارہ: 4 اپریل 2018 | صفحات: Total Pages 64

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

نگارشات ارسال کرنے کے لیے ای میل: kduniya@ncpul.in

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

مشیر: شعیب رضا فاطمی

فہرست

اداریہ

مکالمہ — مدیر — 4

شخصیت

مختلف زاویوں کی پارکھا افسانہ نگار - ش - بانو سلویب — صبیحہ اطہر — 5

محفلِ سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 7

جہانِ نسواں

ساغر نظامی: میرے مرحوم شوہر — ذکیہ سلطانہ نیر — 8

ماموں یا چچو: خواجہ احمد عباس — زاہدہ زیدی — 10

عالمی سطح پر اردو زبان کی مقبولیت — عائشہ فرحین — 15

احتیاطی تدابیر: برائے خاتونِ خانہ — شاہین فاطمہ زیبا — 18

اردو شاعری میں وطن دوستی — فردوس مسرت — 20

قانون میں خواتین

خواتین کے خلاف خانگی تشدد............خواجہ عبدالمنتقم — 24

کہانیاں

چوڑی والا — صالحہ عابد حسین — 28

اگر — آمنہ ابوالحسن — 32

گزرے موسم کی تپش — ترنم جہاں شبنم — 37

یوں بھی جیا کرتے ہیں — فاطمہ ترمذی — 40

کہانی در کہانی — فرزانہ اسد — 43

ہتھیلیوں کی زبان — فردوس حیدر — 46

حسنِ سخن

ادا جعفری 50 رخسانہ جبیں 51، صبا عزیز، 51 سیفی ریا 52

باورچی خانہ

موسمِ گرما اور مشروبات — اسماء انصاری — 53

صحت

خواتین میں روزمرہ کی بیماریاں...... — سید محمد حسان نگرامی — 55

انیمیا: خواتین کا ایک عام مرض — زرین حلیم — 57

آرائش و زیبائش

چہرے کی چربی کم کرنے کے آسان طریقے — 59

تاثرات: گر گر سے — 61

قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

مقامِ اشاعت و صدر دفتر: فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025 فون: 49539000

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066 فون: 26109746 فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، سالار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مکالمہ

خواتین دنیا دنیا کی سب سے حسین تخلیق کے جذبات و احساسات کا ترجمان بنتا جا رہا ہے اور اس کی بھرپور پذیرائی ہو رہی ہے.....

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ آدھی آبادی کے تمام تخلیقی زاویوں کو اس ایک رسالے میں سمیٹنا آسان نہیں کیونکہ خواتین کے جذبات کے بحرِ بیکراں کا اتنا وسیع کینوس ہے اور ان کے لیے اتنے رنگوں کی ضرورت ہے جن رنگوں کا نام بھی ابھی عالمِ وجود میں نہیں آیا ہے۔ عورت کو ہر دور میں کائنات کی سب سے حسین تخلیق قرار دیا گیا ہے اب اس حسین تخلیق کے تخلیقی وجدان تک رسائی آسان کیونکر ہو سکتی ہے۔ ہم نے تو صرف صفحات فراہم کیے ہیں تاکہ اس بدلتی اور جدید سے جدید تر ہوتی دنیا میں جب خواتین مردوں کے شانہ بشانہ چل رہی ہیں اور بڑے بڑے معرکے سر کر رہی ہیں ادب کے میدان کارزار میں بھی دو دو ہاتھ کریں اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر گل و آتش کی آمیزش سے ایک نیا رنگ خلق کریں جس میں اردو زبان کی چاشنی بھی ہو اور پامردی بھی، مروت و خلوص کی پیوندکاری بھی ہو اور نئے زمانے کے مزاج و منہاج کی عکاسی بھی۔

آج ساری دنیا میں کلچر کے اکتساب پر زور دیا جا رہا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ کلچر کا تعلق انفرادی اور اجتماعی ذہن سے بہت گہرا ہے اور یہ کلچر ہی ہے جو سماج کے بڑے گروہ کو یکجا رکھتا ہے اور ان میں باہمی ملنساری کی ترغیب دیتا ہے۔ ہم نے بارہا بزرگوں سے سنا ہے اور کتابوں میں پڑھا ہے کہ عورت کی گود ایک انسان کا اولین مدرسہ ہوتا ہے یعنی ایک جیتے جاگتے گوشت پوست سے مزین انسان کے ذہن کو کیسا ہونا چاہیے، اسے سماج اور معاشرے کے لیے کس قدر سود مند بنایا جائے اس کے لیے ماں ہی پہل کرتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ ماں کس قدر آگاہ ہے اپنے اس کارِ عظیم سے۔ مہذب معاشرے میں خواتین کی تعلیم و تربیت پر اسی لیے سنجیدگی سے غور کیا جاتا ہے تاکہ معاشرے کی بنیاد جن انسانوں پر ہوتی ہے ان کی تربیت کا خشتِ اول اتنا مضبوط اور دیرپا ہو کہ اسے جہل و تاریکی کا طوفان گزند نہ پہنچا سکے۔ 'خواتین دنیا' کے مشمولات کو ایک بڑا کینوس اسی لیے دیا گیا ہے تاکہ یہاں فنونِ لطیفہ کے تمام رنگ بھی نظر آئیں اور معروضی انکشافات سے بھی قارئین بہرہ مند ہو سکیں۔ ہم کو احساس ہے کہ موجودہ دور میں خواتین تمام میدانوں میں بہترین خدمات انجام دے رہی ہیں ضرورت ہے کہ ایسی خواتین کی جملہ زندگی کے تجربات و مشاہدات کو منظرِ عام پر لایا جائے جو دستاویز بھی بنے اور جسے دیکھ اور پڑھ کر ہماری بچیاں اور ہماری خواتین اور زیادہ فعال ہوں ان کو مثال بنائیں اور دیکھیں کہ اسی ماحول میں جس میں وہ رہ رہی ہیں ایسے ہی تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کر کے انھوں نے کس طرح اپنے مقاصد حاصل کیے۔ اس رسالے کے مشمولات میں انٹرویو شائع کرنے کا یہی مقصد ہے اور اس کے لیے ملک اور بیرون ملک کی کسی بھی خاتون کا انتخاب کیا جا سکتا ہے کسی بھی میدان میں نمایاں کردار ادا کرنے والی خاتون کا انٹرویو لے کر اسے شائع کرنے کے لیے بھیجا جا سکتا ہے۔

زندگی رواں دواں اور ہر دم جوان رہنے کا نام ہے۔ ادب ہو یا ثقافت، آرٹ ہو یا موسیقی ان سب کا مقصد یہی ہے کہ ہمارا ملک معاشرہ اور اس میں رہنے بسنے والے لوگ خوش و خرم اور باہم اخلاق و مروت کا نمونہ بن جائیں۔ خود بھی خوش رہیں اور دوسروں میں بھی خوشیاں تقسیم کریں۔ مذہب ذات نسل اور صنفی امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر ساری دنیا کے لوگوں کو عیال اللہ سمجھتے ہوئے محبت اور صرف محبت کے پیغام کو عام کریں یہی ادب کا بھی پیغام ہے اور یہی خواتین دنیا کا بھی۔

قومی اردو کونسل اردو زبان و ادب کی شیرینی کو گھر گھر تقسیم کرنے کے اپنے مشن میں نہایت پامردی اور انہماک سے سرگرم ہے اردو زبان و ادب کے چاہنے والوں سے گذارش ہے کہ وہ خود بھی اردو زبان کی آبیاری کریں اور اپنے حلقے میں بھی اردو زبان کو متعارف کرانے کا اہم فریضہ انجام دیں۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

مختلف زاویوں کی پارکھ افسانہ نگار

ش۔بانو۔ادیب

صبیحہ اطہر

ش۔بانو۔ادیب ایک لائق اور بالغ نظر افسانہ نگار ہیں۔انھوں نے تقریباً 1960 سے قبل افسانہ نگاری شروع کی۔ ہندوستان کے معیاری رسائل وجرائد میں ان کے افسانے زینت افروز ہوتے رہے۔انھوں نے 20-22 برس تک کے اپنے افسانوی سفر میں اپنے قاری کے ذہن ودل پر دستک دی ہے۔ان کے قاری نے بھی ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔جس زمانے میں وہ افسانے لکھ رہی تھیں وہ زمانہ واجدہ تبسم، عصمت چغتائی، رضیہ بٹ، اے۔آر۔خاتون، سجاد ظہیر اور عفت موہانی کا ادبی زمانہ تھا۔اس دور میں رہ کر ش۔بانو۔ادیب نے اپنے قاری کے دل میں جگہ ضرور محفوظ کی۔حالانکہ ان مذکورہ افسانہ نگاروں کے سامنے وہ آواز بہت بلند تو نہ ہوسکی لیکن خاموش بھی نہیں ہوئی۔۔اس عہد کے تقاضے اس عہد سے قطعی مختلف تھے۔اپنے اُس گھٹن والے معاشرہ میں خواتین شاعرات وافسانہ نگاروں کا اپنے وجود کو قائم رکھنا بھی بڑی بات ہے۔

ش۔بانو۔ادیب کے افسانوں کا وصف یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں جو کچھ بھی دیکھا اور جو کچھ مطالعہ کیا اسے من وعن افسانے کے پیرائے میں پیش کردیا۔ش۔بانو۔ادیب کے افسانوں کی نثر بہت چست اور مضبوط ہے۔ان کے افسانوں کی زبان وبیان میں روانی، پختگی اور دلکشی ہے۔

افسانہ سے زندگی کے حقائق اور تلخیوں کا پتہ چلتا ہے۔آنسوؤں اور قہقہوں سے گفتگو کرنے کا نام افسانہ نگاری نہیں ہے۔ان کے عہد میں رومانی افسانے لکھنے کا چلن عام تھا۔افسانہ نگار اپنے قاری کے زبان کے چٹخارے کو سمجھتی تھی۔انھوں نے رومانی افسانوں کے ساتھ ساتھ عصری مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں شامل کیا ہے۔ملاحظہ کیجئے۔

''وہ جائے نماز پر بیٹھ کر زاروقطار رو رو کر اللہ تبارک تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہا تھا۔اچانک پوسٹ مین نے اُس کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ ریاض احمد نے لپک کر دروازہ کھولا۔سامنے پوسٹ مین کھڑا تھا۔پوسٹ مین نے اسے لاٹری میں نکلا ہوا 45 ہزار روپے کا ڈرافٹ دیا۔اُس کی آنکھوں سے خوشی سے امڈا ہوا سیلاب بہنے لگا۔

ریاض احمد کو محسوس ہوا کہ اللہ نے اُس کی دعا سن لی ہے۔اُس نے اطمینان کی سانس لی۔اللہ نے بیٹی کی سگائی سے ایک ہفتہ قبل ہی معقول انتظام کردیا تھا۔وہ سوچ رہا تھا کہ اللہ اپنی مخلوق کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا ہے جبکہ اُس کی مخلوق اسے ضرورت میں ہی یاد کرتی ہے۔(اللہ مالک ہے)

ش۔بانو۔ادیب کے افسانوں میں رنگارنگ مناظر ہیں۔ان کے یہاں عہد گزشتہ کی پرچھائیاں بھی ہیں، عہد حاضر کی مایوسیاں اور کرب بھی اور عہد آئندہ کے روشن امکانات بھی۔ وہ زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھتی، پرکھتی اور برتتی ہیں۔

ش۔بانو۔ادیب نے زندگی کے سلگتے ہوئے موضوعات پر لکھنے کی ہمیشہ پہل کی ہے۔سلگتے ہوئے موضوعات پر اُن کا افسانہ ''موت کے پھول'' پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔جب انسان درندگی کی کیفیت میں آجاتا ہے تو وہ جنسی استحصال کی بھٹی میں جل کر یہ بھول جاتا ہے کہ انسانیت کیا ہے۔اسی طرح دو بہن بھائیوں کا ماجرہ دیکھئے کہ ایک بھائی داد عیش وصول کرنے میں کس قدر بہن کے ساتھ اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کرلیتا ہے۔اس دل سوز منظر کو دیکھئے۔

پھول چونک گیا۔وہ اس کی جانی پہچانی آواز اُس کی بہن رنجنا کی تھی۔بجلی روشن کی۔اس کے سامنے رنجنا کا ٹمٹماتا ہوا چہرہ جھلسلا رہا تھا۔

پھول بدم خوردہ گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ (موت کے پھول)

ش، بانو، ادیب اپنے قاری کو اپنے سماج کا بھدا، کھردرا اور بدنما چہرہ دکھاتی ہیں۔ وہ بتاتی ہیں کہ کس قدر ہمارے عہد میں جسم کا کاروبار ہو رہا ہے اور یہ جسمانی استحصال کس طرح ہمارے معاشرہ کی اقدار کو گندا کر رہا ہے۔

ہر عہد میں رشوت خوری نے معاشرہ کو جھنجوڑا ہے۔ ہمارے غلط کام بھی نوٹوں پر گاندھی جی کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر افسر کر دیتا ہے اس بات کا اظہار وہ اس طرح کرتی ہیں۔

''داروغہ دونے کمار نے سنیل کو ڈراتے ہوئے کہا۔ تم اپنی اس جیل یاترا کو تمام عمر بھول نہیں پاؤ گے۔ سنیل نے ڈرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ اس کی جیب میں گاندھی والی تصویر کے کچھ نوٹ ڈالے تو داروغہ نے ہنستے ہوئے مصلحت بھرے انداز میں کہا۔ تم بے قصور ہو۔ میں تمہارے خلاف مقدمہ درج نہیں کر سکتا۔ حوالات میں بند ایک شخص کو اپنے پاس بلا کر دو چار مغلظات سے نوازا۔ میں دیکھتا ہوں۔ تمہیں بھی اور تمہارے سفارشی کو بھی۔ تمہیں وہ کیسے بچائے گا۔ سنیل کے خلاف جو مقدمہ درج ہونا تھا وہ اس شخص کے نام درج کر دیا اور سنیل کو باعزت رخصت کر دیا۔ (جیل یاترا)

کرپشن اور رشوت خوری کو اپنے افسانے 'جیل یاترا' کے ذریعہ کس طرح ش، بانو، ادیب نے اجاگر کیا ہے۔ معاشرہ کی غلاظت اور خرابی کے منھ پر انھوں نے زبردست طمانچہ مارا ہے۔ ش، بانو، ادیب کے افسانوں میں روزمرہ کی زندگی اور واقعات در آتے ہیں جنھیں وہ نہایت سلیقے، ترتیب اور تہذیب سے آراستہ کر دیتی ہیں۔ زبان و بیان پر وہ قادر ہیں روزمرہ کے واقعات اور زندگی کے موضوعات کے ذریعہ وہ اپنے افسانے کے خدوخال کو سنوارنے میں ماہر فن ہیں۔ ان کے افسانوں میں بیانیہ کے ساتھ ساتھ حقیقی روپ کی منظر کشی بھی ہے جس سے افسانہ نگار کی بصیرت و بصارت کا پتہ چلتا ہے۔

ش، بانو، ادیب کے افسانوں کا وصف یہ ہے کہ ان میں معاشرہ سے وابستہ موضوعات در آتے ہیں۔ ان کے افسانے کا ایک ایک گوشہ معنی خیز ہوتا ہے۔ انسانی وجود کے ساتھ ان کے افسانے کا رشتہ مستحکم و استوار ہوتا ہے۔

وہ جس دل جمعی اور لگن کے ساتھ افسانہ لکھتی ہیں اُن کا قاری بھی اسی انہماک اور توجہ سے اُن کے افسانے کا مطالعہ کر کے اس سے استفادہ حاصل کرتا ہے۔ ش، بانو، ادیب اپنے افسانے کی رگ و پے میں اس قدر سرایت کر جاتی ہیں کہ وہ فن پارہ معاشرہ سے خود سوال کرنے کی صلاحیت رکھنے لگتا ہے اور معاشرہ کو جھنجوڑ کر اسے آئینۂ حق دکھانے کی سعی کرتا ہے یہی ان کی فنکارانہ صلاحیت ہے جو انھیں ان کے قاری کے دل میں جگہ دیتی ہے۔

Sabiha Athar
H.No. F/F 9/322
Lalita Park, Lakshmi Nagar
Delh-110092

فرہنگ آصفیہ

عرق عرق ہونا: جب آدمی کی طبیعت غم و ہم یا خجلت و انفعال سے گھٹتی ہے اور دل پر زور پڑتا ہے تو اس کی توجہ سانس لینے کی طرف کم ہو جاتی ہے اور اس انقباض سے جو بخارات قلب جسم کے اندر جمع ہوتے ہیں وہ مسامات کی راہ سے نکلنا چاہتے ہیں، جہاں پہنچ کر ہوا کے سرد کی آمیزش سے پانی بن جاتے ہیں۔ چوں کہ اکثر بخارات اوپر کی طرف صعود کیا کرتے ہیں اس سبب اول چہرہ پر پسینہ آیا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آدمی کو شرمندگی سے بہت بڑا صدمہ پہنچتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ اپنی طبیعت پر زور ڈال کر بکثرت بخارات پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے شعرا نے عرق عرق یا آب آب ہونے سے علامت انفعال پر اطلاق کر لیا ہے۔ آگے خدا جانے۔

آب بقا: پہلے لوگوں کا خیال ہے کہ بحر ظلمات میں ایک ایسا چشمہ ہے جس کا پانی پی لینے سے آدمی کبھی نہیں مرتا۔ خضر علیہ السلام سکندر اعظم کے واسطے اس چشمہ کے رہنما بنے تھے۔ بعضے تو کہتے ہیں کہ سکندر وہاں پہنچا تو اس نے اس پانی پینے والوں کو دیکھا کہ لوتھ ہوتھ پڑے ہیں، زندگی ہوتی نہ ہوتی برابر ہے۔ نہ تو مرتے ہی ہیں اور نہ جسم ہی کچھ کام دیتا ہے اس نے پہلے تو چلو میں پانی لیا۔ پھر اس کا اسی میں ڈال دیا۔ مگر خضر نے پی لیا۔ جو آج تک زندہ ہیں اور بعضوں نے لکھا ہے کہ اثنائے راہ میں خضر اور راستہ پر پڑ گئے اور سکندر اور راستہ ہو لیا۔ خضر تو اس چشمہ تک پہنچے اور اپنی مراد حاصل کی مگر سکندر اس نعمت سے محروم رہا۔ راہ ظلمت میں مار کر ہو لمشقت خضر کو کون مرنے جانے آپ زندگانی کے لیے۔

شاعرات کے منتخب اشعار

سارے انسان ہو گئے غائب
اب تو بس واقعات روشن ہیں

روشنی کی جہاں حکومت تھی
اب اندھیروں کا زور چلتا ہے

(شائستہ یوسف)

چراغ زندگی گل ہو گیا ہے
نظر سے دور جب سے وہ گیا ہے

بھرے گھر کا یہ عالم ہے کہ تجھ بن
عجب اک ہو کا عالم ہو گیا ہے

(اسما سعید)

نہ پاسکی میں کبھی جس کی گرد پا تک بھی
وہی خیال میں بن کے غزال آتا ہے

قدم قدم پہ بہاروں کا حسن ہے لیکن
مجھے تو یاد تمھارا جمال آتا ہے

(ام ہانی)

وہ زخم جو بے نمو رہا ہے
اس زخم کی روشنی سوا تھی

دیکھ کر تمھیں خوش ہو جاؤں
میری آسودگی جاں دیکھو

(عشرت آفرین)

قدم اٹھائے ہیں ہم نے بھی اس یقین کے ساتھ
جہاں سے گزریں گے ہم تیری رہ گزر ہوگی

ہم تری سنگ دلی سے بھی نہیں ہیں مایوس
لوگ کہتے ہیں کہ پتھر میں خدا ہوتا ہے

(مظفر النساء ناز)

کیسے کیسے دل نشیں خوابوں کے منظر لے گیا
میری آنکھوں سے کوئی نیندیں چرا کر لے گیا

رب کریم کو بھی کیا میری دعا سے بیر تھا
ہجر نصیب کر دیا شوق وصال کے سبب

(شان معراج)

قاعدے قانون کی دھجی اڑا کر چل دیے
دن دہاڑے بے وجہ لاشیں بچھا کر چل دیے

کہتے ہیں خود کو مسیحا دین دکھیوں کے ، مگر
ہڈیوں پر ان کے، اپنا گھر بنا کر چل دیے

(اوشا کرن)

گاؤں ایسا ہوا شہر لوگو!
کھوج ہے ، نہ کوئی خبر لوگو!

آپ بھی اک مکان لے لینا!
بس رہا ہے الگ گھر لوگو!

(ڈاکٹر بھاونا)

ذکیہ سلطانہ نیر

ساغر نظامی: میرے مرحوم شوہر

ساغر کی نگاہ سے پون صدی گزری اور پون صدی کے ہجوم سے ساغر گزرے۔ خواب اور حقائق عزائم اور مقاصد، روایات اور اجتہادات، ناکامی و کامیابی اور امید و بیم کا ایک طلسم زمانے کے ساتھ ساتھ رنگا رنگ انداز سے ان کی نگاہوں کے سامنے آتا رہا۔ اور ساغر فطرت اور وقت کی ہر عطا پر لبیک کہتے رہے۔ ہر آنے والا لمحہ انھیں ادراک و بصیرت کی دولت بخشتا رہا۔ ساغر کے اشعار خود ساغر کے پیکر معنوی ہیں جن میں فکر و فلسفہ، حسن و عشق اور موت و زندگی کی عریاں صداقتیں اپنے جمال و جلال کے ساتھ نمایاں ہوتی ہیں۔

ساغر ایک ہمہ صفت موصوف شخصیات کے مالک تھے۔ شاعر بھی، انشا پرداز بھی ڈرامہ نگار بھی، اور افسانہ نویس بھی۔ صحافی اور مقرر بھی۔ خدا نے انھیں ذوق سلیم اور فہم رسا کی دولت عطا کی تھی۔ تخیل کی بلند پروازی عقل کی تیزی، ذہن کی رسائی، قوت اجتہاد، خوب سے خوب تر کے لیے مسلسل جہد، مسرت اور غم دونوں حالتوں میں لبوں پر ایک خندۂ سرشار۔ زندگی کے ہر موڑ پر، حیات کے ہر مرحلے پر ساغر رنگا رنگ صفات کے ساتھ نظر آتے رہے۔

ساغر ایک خود ساز شخصیت تھے انھوں نے اپنی زندگی کی عمارت خود تعمیر کی، ساغر نے اپنی تعلیم و تربیت، معاشی اور کفالت اور شہرت و کامیابی کا مجسمہ زندگی کی سنگین چٹان سے خود ہی تراشا تھا۔ ساغر نے شروع ہی سے فکر و خیال کی نئی راہیں نکالیں۔ نئے الفاظ اور ان کے استعمال کا نیا انداز اختیار کیا۔ نئی تہذیب کی کھلے دل سے پذیرائی، وقت سے ہم دوشی کا ولولہ، مستقبل کی ہم رکابی کا حوصلہ اور زندگی کے ہر موڑ پر شدید زندگی سے پا مردی کے ساتھ مقابلہ ساغر کے کردار کی نمایاں خصوصیات تھیں:

دھارے کے موافق بہنا کیا تو ہیں دست و بازو ہے
پروردۂ طوفاں کشتی کو دھارے کے مخالف بہنے دے۔

ساغر نظامی کے کلام میں غم کا عنصر کم ہے۔ اور جتنا ہے وہ بھی کسی صوفی یا جوگی کا غم نہیں ہے بلکہ اس انسان کا الم ہے جو دنیا اور دنیا کی چیزوں کو دنیاوی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان کا فن فکر کی آماجگاہ ہے۔ ساغر کی شاعری محض مجلسی نہیں بلکہ انسانی فکر و آلام کی ترجمان ہے۔ ان کی شاعری میں بلیغ اشارے چھلکتے ہیں۔ ان کے خیالات و جذبات میں شروع سے آخر تک ایک بالیدگی پائی جاتی ہے۔ ساغر کی تخلیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اک نئے آغاز کا جشن مسرت ہو رہا ہے۔ ان کے کلام میں انسانیت کے ارتقا کے متعلق یقین کی نشان دہی ملتی ہے، ساغر کی شاعری محرک ہے، ان کے نغمے انسان کے اندر جینے کا ولولہ پیدا کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ساغر کی شاعری میں آپ ایک نشاط اور سرشاری پائیں گے۔ دنیا کے غم والم سہنے کی طاقت پائیں گے اور ظرف غم ساغر کی شاعری میں سب سے زیادہ ہے۔ تبھی تو وہ کہہ سکتے ہیں:

آنسو تو وہی ہے جو رواں ہونے نہ پائے

وہ کسی عمر میں بھی شکست کھانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کی قوت ارادی ہمیشہ نیا زرہ بکتر پہن کر زندگی کے مقابلے کے لیے تیار رہتی۔ ان کی ذات کی طرح ان کی شاعری میں بھی ہمیشہ نئی قوتیں ابھرتی رہی ہیں۔

اپنی غزل میں وہ وقت کے نئے میلانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ساغر نے غزل کے ساتھ دوسرے اسالیب بھی اختیار کیے۔ وہ نظم بھی لکھتے تھے اور گیت بھی لکھتے تھے۔ تخیل کی نغمگی اور جذبے کی رجزیت ان کے کلام کی خصوصیت تھی۔ اسلوب سے قطع نظر ان کی فکر کسی ایک خانے میں محدود نہیں تھی۔ وہ جدید سے جدید تر کے قائل تھے۔ اصل میں اب

زندگی اتنی تہہ دار ہوگئی ہے کہ کوئی شخص اکہری زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ ساغر نے اس راز کو خوب سمجھا اور ہمہ جہت جدوجہد جاری رکھی۔ ساغر انقلاب اور ترقی کے علمبردار تھے اور ان کا ہاتھ ہمیشہ کروٹ لیتی ہوئی قدروں کی نبض پر رہا وہ زندگی کے سنگین حقائق سے لاپروا اور بیگانہ نہیں بلکہ ان حقائق کے رازداں ہیں، وہ رجعت پسند سماج اور شکست خوردہ ذہن سے سخت نفرت کرتے تھے، ساغر یہ بات علانیہ کہتے تھے کہ غزل کو بہت نیا لباس پہنانا مشکل ہے۔ مگر وہ غزل کے عشاق میں سے تھے۔ ساغر کی غزل میں ایک کیف ہے، وجد ہے، رقص ہے، ترنم ہے، محویت ہے وارفتگی ہے اور روایت کے خلاف ایک عاشقانہ رجزیت بھی۔ ساغر اپنی اچھائیوں اور برائیوں کے سب سے بڑے پارکھ تھے۔ ترک و اختیار پر انھیں قدرت کاملہ حاصل تھی اس کے باوجود کہ ساغر موجودہ بے حس اور بے ذوق سوسائٹی کے اطوار و انداز کے سخت مخالف تھے اور اس سے ان کی نفرت روز بروز بڑھتی جاتی تھی، ان کے اندر مایوسی اور جمود پیدا نہیں ہوا۔ اور وہ پرامید رہے کہ ان کو نہیں تو آنے والی نسلوں کو ایک با معنی حساس اور خوش ذوق سوسائٹی ضرور نصیب ہوگی اور اس سماج کی بنیاد خوشحالی اور آسودگی پر رکھی جائے گی۔

ساغر نے اپنے رسائل 'پیمانہ' اور 'ایشیا' میں بہت سے شاعروں کے محاسن کا اعتراف ہی نہیں کیا اشتہار بھی دیا۔ مگر دوسروں کا تو کیا ذکر خود ساغر نے ساغر کی طرف سے تقریباً 40 برس آنکھ بند رکھی۔ ساغر نے شکنتلا، انارکلی، شہرو نامہ اور مشعل آزادی جیسی طویل نظمیں لکھیں اور یہ شائع ہوئیں لیکن تقریباً 40 برس کی مدت میں کہا ہوا دوسرا کلام ابھی نقل بھی نہیں ہوا ہے۔ اور یہ ساغر کا شاعرانہ استغنا تھا۔

1857 کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد غیر ملکی حاکموں نے ناقابل بیان مظالم ہندوستانیوں پر ڈھائے اور بالآخر کامل غلبہ حاصل کر لیا۔ اب ایک پرسکون ماحول مغربی تعلیم و تمدن کے پھیلنے کے لیے میسر آگیا لیکن یہی وہ وقت تھا جب رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کا سماجی اور سیاسی شعور جاگا۔ اردو شاعری میں 'وطنیت' کا تصور مغربی ادب سے پیدا ہوا لیکن آزادی کا تصور۔ فرد کی اہمیت اور ایسے ہی دوسرے نئے موضوع ہمیں صرف مغربی ادب کے مطالع نے نہیں دیے بلکہ یہ انگریزی اقتدار و تسلط کا نتیجہ تھے۔ ساغر ان اردو شاعروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، جنھوں نے شروع سے آخیر تک قومی تحریکوں کا ساتھ دیا۔

ساغر باغیانہ احساسات کو ہمیشہ ابھارتے رہے۔ ملک آزاد ہوجانے کے بعد بھی ساغر کا باغیانہ آہنگ قائم رہا مگر اب ان کی بغاوت سماجی نابرابری، ناانصافی اور رجعت پرستی کے خلاف تھی۔

ساغر صرف سماج کے ظالم عناصر ہی کو نہیں للکارتے بھی کبھی ان کی للکار سماج اور سماج سے گذر کر آفاق کو بھی پار کر جاتی ہے:

اے کاتبِ تقدیر ہماری بھی رضا پوچھ
یوں نامۂ تقدیر رقم ہونے نہ دیں گے

ساغر زندگی کا ایک اصول رکھتے تھے اور اس اصول کے مطابق جینا یا مرنا چاہتے تھے۔ وہ خوددار تھے لیکن خود پرست نہیں وہ اس کے قائل تھے کہ ادب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جاسکتا مگر شاعر کو عملی سیاست میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ایسا کرنا اس کی موت ہے۔ وہ ادب کے مقابلے میں عملی سیاست کو کمتر درجے کی چیز سمجھتے تھے۔

ساغر قدامت سے صرف چند چیزیں انتخاب کرنے ہی کو عقل مندی سمجھتے تھے ورنہ وہ ماضی کی سوسائٹی کو، جو جاگیردارانہ سوسائٹی تھی، اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اس کو یاد کیا جائے۔ ان کا خیال تھا انسان کی موجودہ نسل کو اجتماعیت کا احساس ہے اور یہ وقت کا سب سے بڑا انعام ہے۔ ساغر ہندوستان میں مذہبی سماج اور مذہبی حکومت کو یہاں کے مختلف العقیدہ باشندوں کے لیے نامناسب خیال کرتے تھے اور اس کے مدعی لوگوں کو ہندوستان کا دوست نہیں سمجھتے تھے۔

ساغر ایک آزاد خیال فنکار تھے ان کا جمالیاتی ذوق اور انسان دوستی کا جذبہ سرحدوں کا پابند نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں مانتے تھے کہ مشرقی اور مغربی عوام میں کوئی فرق ہے۔ کالے گورے میں کوئی امتیاز ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی، برہمن اور ہریجن میں کسی نہج سے بھی کوئی دوری ہے۔ ساغر کہتے تھے 'انسانیت کی بقا اور دنیا کے تمام سماجوں کے امن اور خوشی کے لیے ضروری ہے کہ ایسی پرانی تاریخیں نذرِ آتش کردی جائیں جو اس عہد کی افواہیں پھیلاتی ہیں جبکہ قومیں بالغ نہیں ہوئی تھیں۔ اور ان سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ جب تک ان کتابوں کا ورد ہوتا رہے گا نوعِ انسان ماضی کے تعصبات سے آزاد نہیں ہوگی، ساغر کے تفکرات اور خیالات ہی سے ہم ان کے فن کا پس منظر سمجھ سکتے ہیں۔

ساغر ہندوستان میں رہنے والوں کے دلوں کو سمندر کی طرح وسیع چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت اور اقتدار حصولِ مسرت کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ تصور نشاط ابدی کا ضامن ہے کہ سارے انسان ایک خاندان کے فرد ہیں۔ مجلسی نظام کی باقی جتنی تعریفیں ہیں وہ غلط ہیں اور اب اپنی عمر پوری کر چکی ہیں۔

ساغر زندگی کا صاف ستھرا ذوق رکھنے والے شاعر تھے اور ان کے فن کی اساس محض رومانیت پر نہیں گہری فکر پر ہے۔

زاہدہ زیدی

ماموں باچھو
خواجہ احمد عباس

خواجہ احمد عباس کی شخصیت اس قدر پہلودار، دلکش، دلنواز، گہری اور شفاف ہے اور ان کے ادبی، فنی، صحافتی اور ثقافتی کارنامے اتنے ہمہ گیر، متنوع اور شاندار ہیں کہ ایک مختصر مضمون میں ان کا احاطہ کرنا تو درکنار، سرسری جائزہ بھی ممکن نہیں۔ ایک ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ ترقی پسند تحریک کی بہترین روایات کے علمبردار ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری کو ان کے جذبے کے خلوص، انقلابی رومانویت اور آئیڈیلزم نے جلا بخشی ہے۔ اور ان کے سیاسی اور سماجی شعور کو ان کی انسان دوستی، دردمندی، اور کچلے ہوئے انسانوں کے ساتھ گہری ہمدردی نے شدت اور تاثیر عطا کی ہے۔ مشاہدے کی توانائی، وسعت نظر، حق گوئی، بے باکی ان کے تمام ادبی اور فنی کارناموں کی پہچان ہے۔ ان کے متعدد ناول مثلاً 'انقلاب'، 'دنیا میرا گاؤں'، 'سات ہندوستانی'، 'ڈاکٹر کوٹنس' اور Tomorrow is Ours اپنی فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ تاریخی دستاویزوں کی اہمیت بھی رکھتے ہیں۔ ان کا شاہکار ناول 'انقلاب' (اور اس کا دوسرا حصہ 'دنیا میرا گاؤں' جو ابھی تک صرف انگلش میں شائع ہوا ہے) تاریخی اور سیاسی حقیقت نگاری اور ذاتی اور داخلی تجربات کے ایک دلکش سنگم کی کامیاب مثال ہے، ان کا ایک آخری دور کا ناول 'تین پہیے' ایک بڑے شہر میں سیدھے سادے لوگوں اور مظلوم طبقوں کے المناک تجربات کی دل شکن داستان ہے جس کی حقیقت نگاری کو جذبات کی شدت اور سماجی اور وجودی احتجاج کی زیریں لہر نے دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اپنے دوسرے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں میں بھی انھوں نے انسانی زندگی کے کسی نہ کسی اہم پہلو کی عکاسی کی ہے اور عصری زندگی میں ظلم، ناانصافی، روایت پرستی، تنگ نظری، ریاکاری، بے حسی اور کرپشن کے گھناؤنے چہرے سے نقاب اٹھائی ہے۔ ان کی اچھی کہانیاں، ڈرامے اور ناول فنی نظم وضبط کی بھی کامیاب مثالیں ہیں اور اس زمرے میں 'انقلاب'، 'دنیا میرا گاؤں'، 'تین پہیے'، 'ابابیل'، 'سردار جی'، 'ایک لڑکی'، 'زعفران کے پھول'، 'نیلی ساری' اور 'سونا ٹا' وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ان کے افسانے اور ناول ہندی میں بھی کافی مقبول ہیں اور انڈین انگلش فکشن رائٹر کی حیثیت سے بھی ان کا شمار صف اول کے ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔

خواجہ احمد عباس کے فلمی کارنامے بھی ان کے ادبی کارناموں کی طرح شاندار ہیں۔ سنجیدہ، باشعور اور فنکارانہ فلموں کی ترویج اور ترقی میں انھیں اولیت کا شرف حاصل ہے، ان کی کئی فلمیں 'دھرتی کے لال'، 'منا'، 'ہمارا گھر' اور 'شہر اور سپنا' نہ صرف ہندوستانی فلم کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ بین الاقوامی فلمی کارناموں میں بھی انھیں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی ایک اور خوبصورت فلم 'آسمان محل' جسے پرتھوی راج کپور کی بے مثال اداکاری نے چار چاند لگا دیے تھے۔ فلمی کامیابی کی ایک تابندہ مثال ہے۔ جس میں نہ صرف ایک بوسیدہ سماج اور اس کی کرم خوردہ اقدار کی جاں کنی کا کرب ہے بلکہ جو ایک نئے سماج کی ابھرتی ہوئی قدروں اور نئی نسل کے خوابوں اور ارادوں کا اشاریہ بھی ہے۔ دوسری کئی اہم فلموں مثلاً 'سات ہندوستانی'، 'دو بوند پانی'، 'نکسلائٹ' اور 'بمبئی رات کی باہوں میں' میں بھی خواجہ احمد عباس نے کسی نہ کسی اہم قومی اور سماجی مسئلے کی طرف توجہ دلائی جن کی اہمیت خود وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور بھی نمایاں ہوگئی ہے۔ 'میرا نام جوکر' ایک بے حس سماج کے پس منظر میں وجودی اور ذاتی تجربات کی حساس اور پُر اثر تصویر کشی ہے، ان کی ایک اور اہم فلم 'پردیسی' ہندروس دوستی کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے،

ان کی فلمی کہانیاں بھی جن پر دوسرے اہم ڈائرکٹروں نے فلمیں بنائیں مثلاً 'نیا سنسار'، 'ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی'، 'آوارہ'، 'شری چار سو بیس' اور 'بوبی' وغیرہ میں بھی عصری زندگی کے کسی نہ کسی اہم پہلو اور عوام کے درد و غم، خوابوں اور مسرتوں کی حساس اور فنکارانہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر ہندوستانی فلم کی بالیدگی اور اسے ایک اعلیٰ مقام عطا کرنے والی شخصیتوں میں عباس کا نام سرِفہرست رکھا جا سکتا ہے۔

خواجہ احمد عباس کے صحافتی کارناموں پر میرا کچھ اظہار خیال کرنا سورج کو چراغ دکھانے سے بھی زیادہ اوچھی بات ہوگی۔ لیکن یہاں اس بات کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ ضروری ہے کہ عباس کی متنوع اور مختلف تخلیقی کاوشوں میں ایک گہرے تسلسل ہم آہنگی اور یکجہتی کے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے جرنلزم میں بھی انہیں اصولوں اور اقدار کی کارفرمائی ہے جو ان کے ادبی، ڈرامائی اور فلمی کارناموں کی پہچان ہے۔ یہ تحریریں بھی حقیقت کی جستجو وسعت نظر اور مشاہدے کی توانائی کی غماز ہیں اور حق گوئی و بے باکی بیان کی سادگی اور اثر انگیزی ان تحریروں کی بھی جان ہے اور یہاں بھی سیاسی اور سماجی فکر کے ساتھ عوامی مسائل اور انسانی اقدار سے گہری وابستگی، آزادی اور انقلاب کے آدرشوں کی عظمت کا احساس، امن عالم کی ضرورت، انسانی مستقبل کے تحفظ کی لگن، ظلم اور ناانصافی کے خلاف احتجاج اور اسی قسم کی دوسری اقدار کی کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے جرنلزم نے ان کے ادب اور فن کو توانائی بخشی اور ان کی ادبی اور فنی صلاحیتوں نے ان کے جرنلزم کو چار چاند لگائے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ احمد عباس صحیح معنوں میں ایک وسیع النظر اور کمٹڈ دانشور اور آرٹسٹ تھے جن کے قول و فعل، ذاتی اور پیشہ وارانہ زندگی میں کوئی تفاوت اور تضاد نہ تھا۔ اور جن کی عالمگیر انسانی اقدار اور ترقی پسند اصولوں سے وابستگی عدیم المثال تھی اور جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اس قسم کے ہمہ گیر اور شاندار کارناموں کا احاطہ کرنا تو درکنار ان کا سرسری جائزہ لینا بھی ممکن نہیں۔ اس لیے میں ان چند تعارفی کلمات کے بعد اپنے باقی مضمون میں اپنی توجہ کچھ ذاتی تاثرات پر مرکوز کروں گی جس سے شاید ان کی شخصیت کے کچھ نقوش ابھر سکیں۔

خواجہ احمد عباس جنہیں ہم پیارے ماموں باچھو کہتے تھے میری والدہ کے سگے چچا زاد بھائی تھے اور مولانا حالی ان دونوں کے پڑنانا تھے۔ لیکن میرے بچپن کی ابتدائی یادوں میں کوئی یاد ایسی نہیں جن کا تعلق ماموں باچھو سے ہو۔ کیونکہ جب میں میرٹھ میں پیدا ہوئی تو وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور جب بھائی ابا (میرے والد) کے انتقال کے بعد 1936 میں ہم لوگ علی گڑھ آ کر رہے تو وہ تعلیم ختم کر کے بمبئی جا چکے تھے۔ اس کے بعد 1938 سے 1947 تک ہم لوگوں کا قیام زیادہ تر پانی پت میں رہا اور اسی زمانے میں، میں ماموں باچھو سے کسی حد تک متعارف ہوئی، ماموں باچھو خود تو کم ہی پانی پت آتے تھے لیکن ان کا تذکرہ اکثر رہتا۔ جس میں میرے لیے دو باتیں خاص طور سے دلچسپی کا باعث تھیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے والد چاہتے تھے کہ وہ سرکاری نوکری کریں یا وکالت کریں انھوں نے جرنلزم کا پیشہ اختیار کیا تھا کیونکہ ان کے خیالات کچھ سوشلسٹ اور انقلابی قسم کے تھے (جس کا مطلب میں اس وقت کم ہی سمجھتی تھی) دوسرے یہ کہ ان کی اماں کو ہر وقت ان کی شادی کی فکر ستاتی تھی لیکن وہ ان کی پسند کی ہوئی کسی لڑکی سے شادی کرنے کو تیار نہ تھے۔ کیونکہ وہ علی گڑھ میں کسی بے حد حسین اور موڈرن قسم کی لڑکی کے عشق میں گرفتار تھے یا پھر شاید بمبئی میں کسی ہندو حسینہ کی زلف گرہ گیر کا شکار ہو گئے تھے۔ ان باتوں کی روشنی میں میرے بچکانہ ذہن نے ان کا ایک خاکہ مرتب کیا اور یہ ایک انقلابی قسم کے رومانٹک ہیرو کی تصویر تھی۔ کچھ عرصے بعد ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'ایک لڑکی' میرے ہاتھ لگا۔ جس میں اکثر کہانیوں کا ہیرو ایک انقلابی قسم کا نوجوان تھا اور ایک بے حد رومانٹک قسم کا عاشق بھی۔ ظاہر ہے کہ میں نے اس کے خد و خال میں ماموں باچھو ہی کی تصویر دیکھی اور میرا خیال اور بھی پختہ ہو گیا۔ میرے نوخیز ذہن کو وہ مثالی شخصیتوں سے زیادہ دلچسپ اور بھلے لگے۔

ماموں باچھو کی شخصیت کا دوسرا نقش اس سے ذرا مختلف تھا اور اس کا تعلق ان کی مایۂ ناز فلم 'دھرتی کے لال' سے ہے۔ اس فلم کو لے کر ماموں باچھو خود پانی پت آئے۔ اور لوکل سنیما ہاؤس میں، جس کی چھت ٹین کی تھی، اس کی نمائش کا انتظام کیا گیا ماموں باچھو نے خاندان کے سب لوگوں کو معہ بچوں اور نوکروں کے انوائٹ کیا۔ ہم لوگ بڑے ذوق و شوق سے فلم دیکھنے گئے۔ ماموں باچھو خود انتظامات میں پیش پیش تھے اور اس وقت وہ بے حد بامقصد اور سنجیدہ نظر آ رہے تھے فلم شروع ہوئی اور قحط بنگال کے دل شکن مناظر پردۂ سیمیں پر نمودار ہونے لگے۔ لیکن یکا یک ہال میں ایک شور و غوغا بلند ہوا۔ لوگ اپنی ٹین کی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اپنے پیسے واپس مانگ رہے تھے۔ انہیں فلم بالکل پسند نہیں آئی تھی کیونکہ نہ اس میں ناچ گانے تھے نہ کوئی خوش ادا ہیروئن! ماموں باچھو خود اسٹیج پر آئے اور لوگوں سے اپیل کی کہ وہ خاموشی سے فلم دیکھیں پیسے انہیں واپس مل جائیں گے کچھ دیر خاموشی رہی لیکن پھر ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اور آخرکار فلم کو درمیان ہی میں روکنا پڑا۔ اس واقعے کا میرے ذہن پر گہرا اثر پڑا۔ اور

جب کئی سال بعد ایک انڈر گریجویٹ کی حیثیت سے میں نے کرشن چندر کے ناولٹ "ان داتا" کو (جس کا تعلق بھی قحط بنگال سے تھا) ڈرامائی شکل دے کر اپنی بہنوں اور دوستوں کی مدد سے علی گڑھ گرلز کالج کے اسٹیج پر پیش کیا تو غالباً اس ابتدائی فنی کاوش کی تہہ میں یہی انسپریشن کارفرما تھا۔

تیسرے اہم واقعے کا تعلق 15 اگست 1947 سے ہے۔ ہم لوگ اس وقت بمبئی گئے ہوئے تھے اور ماموں باچھو کے ہاں ٹھہرے تھے۔ میری سب سے بڑی بہن صابرہ زیدی (مرحومہ) اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ روانہ ہونے والی تھیں اور اس سلسلے میں انھوں نے پردہ چھوڑ دیا تھا۔ میری دوسری بہن ساجدہ زیدی جن کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی، شادی کے بعد برقعے کو خیر باد کر چکی تھیں۔ لیکن ہم تینوں چھوٹی بہنیں یعنی میں شاہدہ اور بیا (خدیجہ عظیم) ابھی تک پردے کی قید و بند میں تھے، ہم تینوں نے آپس میں مشورہ کیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ اب ہم بھی ہرگز پردہ نہیں کریں گے، یہ بات ماموں باچھو کے بھی گوش گزار کر دی گئی اور وہ سن کر خوش ہوئے۔ دوسرے دن یعنی 15 اگست کو شام کے قریب ماموں باچھو نے ایک ٹیکسی منگائی اور کافی زور سے چلانا شروع کیا کہ جس جس کو جشن آزادی دیکھنا ہے وہ فوراً ان کے ساتھ چلے۔ "جلدی کرو بچیو" انھوں نے کہا "سجنے بننے تیار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کوئی تمھیں نہیں دیکھے گا"۔ اور ہم لوگ جو پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے جلدی سے دوڑ کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ اور آن کی آن میں ماموں باچھو کے ساتھ نظروں سے غائب ہو گئے ہماری اماں اور خاندان کی دوسری خواتین حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ اس طرح جب ہندوستان کو آزادی ملی تو ہم نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور اس انقلابی اقدام میں ماموں باچھو ہمارے ساتھ تھے۔

ماموں باچھو سے ایک اور دلچسپ ملاقات 1957 میں ماسکو میں ہوئی، میں وہاں کیمرج سے یوتھ فیسٹول میں شرکت کے لیے آئی ہوئی تھی اور ماموں باچھو ایک فلمی یونٹ کے ساتھ ماسکو آئے تھے۔ میری تین بہنیں کچھ عرصے سے ماسکو میں تھیں، میں وہاں کیمرج سے یوتھ فیسٹول میں شرکت کے لیے آئی ہوئی تھی اور ماموں باچھو ایک فلمی یونٹ کے ساتھ ماسکو آئے تھے میری تین بہنیں کچھ عرصے سے ماسکو ہی میں قیام پذیر تھیں۔ ماموں اور باچھو دن بھر بے حد مصروف رہتے لیکن رات کو اکثر میری بہنوں کے ہاں محفل جمتی اور عزیزوں اور دوستوں کے جھرمٹ میں ماموں باچھو شمع محفل ہوتے، میری بڑی بہن صابرہ زیدی کی طرح وہ شراب کو ہاتھ نہ لگاتے لیکن پرلطف اور سنجیدہ گفتگو، ہنسنا ہنسانا، لطیفہ گوئی گویا انھیں دونوں کا حصہ تھا۔ اس زمانے میں یہ بھی سنا کہ ماموں باچھو کھانا پکانے کے فن میں ماہر ہو گئے تھے۔ اور بقول خود بالکل اور یجنل انداز سے کھانا پکاتے تھے۔ لیکن اس وقت ان کے ہاتھ کا پکا کھانا کھانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس واقعے کے سالہا سال بعد یعنی شاید صرف نو، دس سال بعد میں اور میری بہن ساجدہ شاید کسی مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی گئے ہوئے تھے۔ اور حسب معمول ماموں باچھو کے ہاں ٹھہرے تھے۔ ماموں باچھو اب کافی کمزور اور معمر ہو گئے تھے۔ وہ جوش اور ولولہ باقی نہیں رہا تھا۔ اکثر خاموش رہتے اور ہر وقت کام میں مصروف رہتے۔ ان کو ذرا خوش کرنے کے لیے ہم نے ان کے کھانا پکانے کا تذکرہ چھیڑ دیا اور شکایتاً کہا کہ ہماری تو انھوں نے کبھی دعوت نہیں کی۔ ماموں باچھو مسکرائے۔ اور کتنی حسین تھی ان کی مسکراہٹ، مسکراتے ہوئے وہ اب بھی کافی کم عمر اور بہت خوبصورت لگتے تھے۔ دوسرے دن صبح سے ماموں باچھو انتظامات میں مصروف ہو گئے کچھ ٹیلی فون کیے، کچھ سامان منگایا اور پھر نوکروں کو سو روپے کا ایک نوٹ دے کر رخصت کر دیا اور ان سے کہا کہ گھومیں پھریں سینما دیکھیں یا جو چاہیں کریں لیکن شام سے پہلے گھر میں قدم نہ رکھیں، ہم لوگوں کو حکم ملا کہ خواتین کمروں میں بیٹھی رہیں۔ باورچی خانے میں قدم نہ رکھیں اور خود کم لڑکیوں اور بچوں کو لے کر کچن میں داخل ہو گئے دوپہر کے قریب مہمان آنا شروع ہوئے۔ اندر راج آنند اور ان کے خاندان کے لوگ، آپا چھاوری اور ان کی لڑکیاں، اور کچھ اور مخصوص اور بے تکلف دوست۔ دیکھتے دیکھتے گھر مہمانوں سے بھر گیا۔ ٹھیک ایک بجے ماموں باچھو کے کم عمر مددگاروں نے میز سجانا شروع کی اور انواع و اقسام کے کھانے میز پر لگا دیے گئے۔ (روٹیاں بازار سے منگائی گئی تھیں) کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ ماموں باچھو خود بڑی محبت سے سب لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے اور شرما شرما کر سویٹ ڈش کے کچھ خراب ہو جانے کی معذرت کر رہے تھے، تو یہ تھے ہمارے باچھو۔ فلسفی کی طرح گمبھیر، مزدور کی طرح جفاکش، ایک بچے کی طرح معصوم اور سادہ دل۔ سمندر کی طرح گہرے اور نیلے آسمان کی طرح شفاف۔

لیکن یہ معمر دانشور اور فنکار، جس کی پیری میں بھی مانند سحر رنگ شباب تھا اگر "حلقۂ یاراں" میں بریشم کی طرح نرم تھا تو رزم حق و باطل میں فولاد بھی بن سکتا تھا اور اس سلسلے کا بھی ایک واقعہ سن لیجیے، جو شاید بارہ تیرہ سال پہلے پیش آیا تھا۔ اس وقت ماموں باچھو عبداللہ گرلز کالج پر ایک فلم بنانے علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ لیکن اسلام کے خود ساختہ ٹھیکیدار اس بات سے بہت ناخوش تھے اور روزانہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا رہتا۔ یہاں تک کہ ایک دن کچھ طالب علم زبردستی گرلز کالج میں گھس آئے، ان کے فوٹوگرافر سے کیمرہ چھین لیا اور یونٹ کے دوسرے لوگوں سے دست و گریباں ہو

گئے۔ دوسرے دن ماموں باچھو کو یونیورسٹی کے کچھ سینئر اساتذہ نے ’ضروری گفتگو‘ کے لیے اسٹاف کلب میں مدعو کیا۔ ہم لوگ (میں اور ساجدہ) وقت مقررہ پر ماموں باچھو کو لے کر پہنچے اسٹاف کلب میں تمام اہم اور مخصوص پروفیسروں کا مجمع تھا۔ اور وائس چانسلر صاحب خود بھی بہ نفس نفیس موجود تھے۔ سب سے پہلے وائس چانسلر صاحب نے جلدی جلدی ایک گول مول سی تقریر کی اور اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد ایک کے بعد ایک سب مخصوص پروفیسروں نے تقریریں کیں جن کا لب لباب یہ تھا کہ حال ہی میں بلٹز میں علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں ایک نامناسب رپورٹ چھپی تھی اور یہ بڑے افسوس کی بات تھی کہ خواجہ صاحب کے ہوتے ہوئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور اب ایک اولڈ بوائے کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ وہ اس رپورٹ کی پرزور تردید کریں اور ہمارے دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کریں۔ ماموں باچھو بڑے مؤدب انداز سے سب پروفیسروں کی تقریریں سنتے رہے اور آخر میں بڑے نرم لہجے میں کہا ’میں خود تو اس رپورٹ کی تردید نہیں کر سکتا کیونکہ بلٹز سے میرا معاہدہ ہے کہ وہ میری ہر تحریر کو بغیر کسی تبدیلی یا کمی بیشی کے شائع کریں گے اور میں بلٹز میں شائع ہوئی کسی رپورٹ کی تردید نہیں کروں گا۔ ہاں میں نجی طور سے ان لوگوں سے کہہ دوں گا کہ اپنا ایک نمائندہ یہاں بھیجیں اور ہر پہلو سے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد ایک متوازن اور معقول رپورٹ شائع کریں‘ لیکن کچھ لوگ مطمئن نہیں ہوئے اور اس بات پر مصر رہے کہ اس سازش کا پردہ انھیں خود چاک کرنا چاہیے، اس پر ماموں باچھو نے کہا کہ ’کیا یہ سچ نہیں ہے کہ یونیورسٹی کے بعض عناصر نے کافی تنگ نظری کا ثبوت دیا ہے اور یہاں کلچرل سرگرمیوں اور دوسرے ترقی پسند اور لبرل اقدامات پر اکثر حملے ہوتے رہے ہیں؟‘ اس پر ایک پروفیسر صاحب جن کی عادت اپنی بات کو ذرا گھما پھرا کر کہنے کی ہے یوں گویا ہوئے کہ ’اگرچہ مجھے کہنا تو نہیں چاہیے لیکن ایسا اکثر ہوتا ہے اور وہ بڑے افسوس کی بات ہے لیکن کیا کیا جائے شاید یہی انسانی فطرت ہے اس لیے اگر مجھے اجازت ہو تو عرض کرنے کی جرأت کروں کہ آپ کو کچھ غلط اطلاعات دی گئی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں‘ اب ماموں باچھو پورے جوش میں آ گئے اور کہنے لگے کہ ’ہو سکتا ہے کہ مجھے کچھ غلط اطلاعات دی گئی ہوں لیکن پچھلے دس دن سے خود میرے ساتھ جو ہو رہا ہے کیا اسے بھی اپنی نظروں کا دھوکا سمجھوں، اور اگر میں خود یہ باتیں Last Page میں لکھ دوں تو کیا آپ اس وقت بھی یہی کہیں گے کہ یہ سب آپ کے دشمنوں کی ریشہ دوانیاں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔‘ اب تو یہ عالم تھا کہ صرف ماموں باچھو بول رہے تھے اور سب پروفیسر حضرات دم بخود تھے۔ علی گڑھ سے واپس جانے کے بعد ماموں باچھو نے وائس چانسلر صاحب (اے۔ ایم خسرو) کو ایک خط لکھا جس میں سب واقعات کا ذکر کرنے کے بعد درخواست کی گئی تھی کہ جن لڑکوں نے نازیبا حرکتیں کی ہیں ان کے خلاف ضروری کارروائی کی جائے (اس خط کی ایک کاپی انھوں نے مجھے اور ساجدہ کو بھی بھیج دی) غالباً اس خط کا کوئی ردعمل نہیں ہوا تو ماموں باچھو نے خود اپنے علی گڑھ کے تجربات اور تاثرات کو انتہائی بے لاگ اور دلچسپ انداز سے Last Page اور آزاد قلم میں پیش کیا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے بعض حلقے آگے کی طرف دیکھنے کی بجائے پیچھے کی طرف دیکھ رہے ہیں اور تاریخ کے دھارے کو عہد وسطیٰ کی طرف موڑ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن پھر شاید انھیں خود خیال آیا کہ یہ تنقید ذرا زیادہ کڑوی ہو گئی ہے اس لیے چند دن بعد اسی کالم میں علی گڑھ یونیورسٹی پر ایک اور مضمون لکھا جس میں علی گڑھ کی روشن اور ترقی پسند روایات کی نشاندہی کی گئی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ یونیورسٹی میں سائنس اور بعض دوسرے شعبوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت سے خوشگوار تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اور اگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تنگ نظر رویوں سے دامن بچا کر اپنے تمام امکانات کو بروئے کار لائے تو قومی زندگی میں ایک اہم رول ادا کر سکتی ہے۔

یادوں اور تاثرات کا سلسلہ بہت طویل ہے، اس لیے آخر میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرے تاثر کے مطابق ماموں باچھو ایک نہایت دلچسپ، ذہین، بااصول، پرخلوص، پرجوش اور سچے انسان تھے جن کا دل محبت کا ایک ساگر تھا جس سے ہر شخص اپنے حوصلے اور صلاحیت کے مطابق فیض یاب ہو سکتا تھا...... وہ ایک رنگا رنگ انسان بھی تھے۔ خاندان کے چھوٹے بچوں سے وہ بےحد محبت کرتے اور انھیں ہر وقت چڑاتے اور مذاق کرتے رہتے۔ میرا بھانجا جب انھیں ’نانا باچھو‘ کہہ کر پکارتا تو کہتے ’نانا ہوگا تیرا باپ میں تو تیرا باچھو بھائی جان ہوں‘ لیکن دوسری طرف ہم بہنوں کو اپنے سے بہت چھوٹا ظاہر کرتے اور اکثر ہمیں لڑکیوں یا بچیو کہہ کر مخاطب کرتے۔ جب میں ذرا کم عمر تھی تو اپنے دوستوں سے کچھ اس طرح میرا تعارف کراتے، ’شاید آپ کو یقین نہ آئے یہ اتنی سی لڑکی فرسٹ کلاس ایم۔ اے ہے (یا کیمبرج سے ڈگری لے کر آئی ہے) اور شاعری بھی کرتی ہے۔‘ وہ اکثر کہا کرتے کہ ہمارے خاندان میں مولانا حالی کے بعد یہ دو شاعرات (میں اور ساجدہ) پیدا ہوئی ہیں۔ جب میں انھیں یاد دلاتی کہ ہماری اماں بھی شاعر ہیں تو وہ کہتے کہ خیر بڑی باجی تو پرائیویٹ شاعرہ ہیں لیکن تم لوگ تو پبلک فگر بنتی جا رہی ہو۔ کبھی کبھار وہ خود بھی شوقیہ تک بندی

کرتے۔ ایک بار جب بہت دن بعد علی گڑھ آئے تو ایک دلچسپ اور بے تکی سی نظم لکھی جس کا پہلا شعر تو یہ تھا:

غازی آباد آ گیا اے دوست
پھر کوئی یاد آ گیا اے دوست

ماموں یا چھو کو اپنے رشتہ داروں کو بڑھانے چڑھانے کا بالکل شوق نہ تھا بلکہ وہ اصولاً اس کے خلاف تھے۔ اس لیے عملی طور پر یا ایک مشہور اہلِ قلم کی حیثیت سے تو انھوں نے ہم بہنوں کی ادبی سرگرمیوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی (بلکہ ادبی حلقوں میں زیادہ تر لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ ہمارے اتنے قریبی رشتہ دار تھے) لیکن نجی طور پر ہماری ادبی کاوشوں کو کافی سراہتے اور ہمت افزائی کرتے رہتے۔ جب میں اپنی کوئی کتاب انھیں پیش کرتی تو شوق سے پڑھتے اور تعریف کرتے۔ اگر میرا کوئی اچھا مضمون یا ڈرامہ ان کی نظر سے گزرتا تو فوراً خط لکھتے اور اس قسم کی چیزیں لکھتے رہنے کا مشورہ دیتے۔ جب میں بمبئی جاتی تو اکثر اپنی کوئی نئی کتاب دیتے اور کوئی خاص کتاب شائع ہوتی تو بذریعہ ڈاک روانہ کرتے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اپنی کتابوں کا سب سے بڑا خریدار میں خود ہوں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ کافی بڑی تعداد میں اپنی کتابیں خرید کر خاص خاص دوستوں اور عزیزوں کو بھیجتے رہتے۔ اگر ہم لوگ کبھی ان سے ان کی کوئی نئی فلم دکھانے کی فرمائش کرتے تو بہت خوش ہوتے اور فوراً تیار ہو جاتے۔ کبھی کسی چھوٹے موٹے ہال میں خاص ہم لوگوں کے لیے فلم شو کراتے اور اگر ہال کا انتظام نہ ہو سکتا تو گھر پر ہی فلم دکھاتے لیکن اگر ہم لوگ انھیں کوئی مشورہ دیتے مثلاً یہ کہ اپنی فلاں ناول پر فلم کیوں نہیں بنائی یا آپ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر فلم کیوں نہیں بناتے تو فوراً خفا ہو جاتے اور زور زور سے چلانا شروع کر دیتے کہ تم لوگ کچھ نہیں سمجھتیں، ویسے ہی میری سب فلمیں فلاپ ہو جاتی ہیں کیا صرف تم لوگوں کو دکھانے کے لیے فلم بناؤں وغیرہ وغیرہ جتنا جتنا وہ خفا ہوتے ہم لوگ ہنستے اور آخر میں وہ خود بھی ہنسنے لگتے۔

اور اب اگر مجھے اس بات پر مجبور کیا جائے کہ میں ذاتی یادوں کے دائرے سے نکل کر معروضی طور پر ان کی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کروں تو میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ خواجہ احمد عباس صحیح معنوں میں ایک Creative Personality یا تخلیقی شخصیت تھے۔ ذہانت، ذکاوت، فکر کی توانائی، جذبے کا خلوص، مشاہدے کا اچھوتا پن، بے ساختگی، جذبات کی فراوانی، ظرافت اور سنجیدگی کا انوکھا سنگم، بچوں جیسی معصومیت، وسعتِ نظر اور ایک ہمہ گیر وژن، یعنی وہ سب خصوصیات جو ایک عظیم تخلیقی شخصیت کی پہچان ہیں ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ اور ساتھ ہی وہ ایک کھلا انسان اور فنکار بھی تھے (اور یہ بھی میری نظر میں ایک عظیم تخلیق کار کی پہچان ہے) جس نے اپنی تمام زندگی ان اعلیٰ قدروں اور آدرشوں کی نذر کر دی جن سے انھیں گہری وابستگی تھی۔ ان کا آخری وصیت نامہ جوان کے انتقال کے بعد بلٹز کے آخری صفحے اور 'آزاد قلم' میں شائع ہوا میری نظر میں ایک 'مختصر شاہکار' ہے جس میں خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ان کے فلسفۂ حیات کے کچھ دلکش، واضح اور شفاف نقوش ابھرتے ہیں اور اگر اس 'وصیت نامے' کو اور زیادہ مختصر کر کے شعری پیرائے میں بیان کیا جائے تو وہ اس شعر کے قالب میں ڈھل جائے گا۔

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

Subscription Form "Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................... بتاریخ.................... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔ خواتین دنیا ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں۔

نام:..

پتہ:..

دستخط

عالمی سطح پر اردو زبان کی مقبولیت

عائشہ فرحین

مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی نمائندہ زبان اردو ہی وہ واحد زبان ہے جس کی مٹھاس کا چرچا ساری دنیا میں ہے۔اردو ہی وہ شیریں زبان ہے جس کے بولنے، پڑھنے اور سننے میں بھی وہ مٹھاس ہے کہ بس سننے والے سر دھننے لگتے ہیں۔اردو نہ صرف برصغیر کی ایک اہم زبان ہے بلکہ اپنی وسعت و ہمہ گیری کے باعث آج اردو زبان عالمی درجہ حاصل ہو چکا ہے۔اس کے بولنے والے دنیا کے مختلف خطوں میں اس کے فروغ میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

اردو ایک خالص ہندوستانی زبان ہے۔جنگ آزادی میں بھی اردو زبان نے بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔یہ زبان کسی ایک فرقہ یا کسی ایک مذہب کی دین نہیں بلکہ ملک و بیرون کے مختلف لوگوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔اس کے باوجود ایک عرصہ تک چند فرقہ پرست طاقتوں نے اردو کو "مسلمانوں کی زبان" کہہ کر اس کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔لیکن ہماری اس زبان میں وہ لچک ہے کہ اسے جس قدر دبانے کی کوشش کی گئی وہ اسی قدر زیادہ ابھر کر سامنے آئی۔

آج اردو تین سو سے زائد ممالک بشمول ہندوستان، پاکستان، افغانستان، جنوبی افریقہ، ایران، بنگلہ دیش، سری لنکا، ملائیشیا، امریکہ، کینیڈا، قطر، میانمار، برطانیہ، دبئی، اور سعودی عربیہ وغیرہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔آج یہ زبان خوشبو کی طرح سارے عالم میں پھیل گئی ہے۔عالمی سطح پر اس کی صورت حال بہتر نظر آتی ہے۔

سارے عالم میں اردو زبان کی مقبولیت کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سب سے زیادہ ہندوستان اور پاکستان میں اردو زبان کے فروغ اور ترویج و اشاعت کے لیے بہت سے ادارے کام کر رہے ہیں۔

آج ہندوستان کی پانچ بڑی ریاستوں، آندھرا پردیش، بہار، جھارکھنڈ، جموں و کشمیر، دہلی اور حال ہی میں اترپردیش (حال ہی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا) میں اردو زبان کو سرکاری اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔جس سے یہاں اس کے چاہنے والوں کی محبت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد "ترقی اردو بیورو" نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔جسے 1996 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان" میں ضم کر دیا گیا۔دور حاضر میں اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے دو اہم سرکاری ادارے کام کر رہے ہیں۔ایک قومی کونسل فروغ برائے فروغ اردو زبان" اور دوسرا "مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی" کی اردو خدمات قابل تحسین ہیں۔

اول الذکر ادارہ حکومت ہند کا خود مختار ادارہ ہے۔جسے حکومت ہند اردو زبان و ادب کے فروغ، ترویج و اشاعت کے لیے مالی امداد فراہم کرتی ہے۔اس کونسل کے تقریباً 587 مراکز سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔اس کونسل نے اردو زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور جدید ٹکنالوجی میں ڈھالنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اس کونسل کا سب سے اہم کارنامہ پورے ملک میں کمپیوٹر ترتیجی مراکز کا قیام ہے۔جس سے اردو کتابت آسان اور جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ ہو گئی ہے۔

انفارمیشن ٹکنالوجی نے ساری دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔انٹرنیٹ نے مختلف ممالک میں حائل حد بندیوں کو توڑ دیا ہے۔اس لیے کونسل کمپیوٹر سے متعلق ملٹی لنگول اردو، انگریزی ڈی ٹی پی DTP، اور آئن لائین کمپیوٹر لرننگ، آئن لائین اردو لرننگ کورسس چلا رہی ہے جس کے دو سو سے زائد مراکز پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ

کونسل نے ڈیجیٹل لائبریری کے ذریعہ محبانِ اردو کے ذوق کو تسکین پہنچائی ہے۔ آن لائن کورسس اور لائبریری ہونے کی وجہ سے دنیا کے مختلف خطوں میں رہنے والے اردو کے شیدائیوں کے لیے تسکین کا سامان فراہم کر رہی ہے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی بھی اردو زبان و ادب کو عالمی سطح پر مقبولیت دلانے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ اس جامعہ میں روایتی طرزِ تعلیم کے ساتھ پیشہ ورانہ تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ رسمی تعلیمی نظام کے ساتھ فاصلاتی نظامِ تعلیم بھی رائج ہے۔ اس کا ایک مرکز دبئی میں بھی قائم ہے۔ رسمی تعلیمی نظام کے تحت گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ کے علاوہ تحقیقی و تنقیدی کام، پروفیشنل کورسس بھی جاری ہیں اور فاصلاتی تعلیمی نظام کے تحت بھی گریجویشن، پوسٹ گریجویشن کے علاوہ ایک سالہ انجینئرنگ ڈپلومہ کورس بذریعہ اردو قائم ہے۔ ان دو سرکاری اداروں کے علاوہ ہندوستان میں کئی اسکولس، کالجس اور خانگی ادارے بھی اردو زبان و ادب کے فروغ اور اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

پاکستان میں اردو زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ یہاں یہ زبان نہ صرف رابطہ کی زبان ہے بلکہ سرکاری اغراض و مقاصد کے لیے بھی۔ یہاں 26 یونیورسٹیوں میں اردو نظامِ تعلیم چل رہا ہے۔ "علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی" تو ملک کے اعلیٰ تعلیمی نظام کو قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن" پاکستان کا اعلیٰ اشاعتی ادارہ ہے۔ جس کا مقصد ملک بھر میں وافر کتب کی فراہمی ہے۔ یہ ادارہ کتب میلوں کا انعقاد بھی کرتا ہے۔ یہاں دیگر ممالک کے مقابلے میں اردو کی تخلیقی رفتار تیز ہے۔

اردو زبان کی عالمی سطح پر اہمیت کے پیشِ نظر دنیا کے چالیس سے زائد نشریاتی ادارے اپنے ملکی اور غیر ملکی سامعین کے لیے اردو نشریات پیش کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں عالمی نشریاتی ادارہ "بی بی سی" کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ تقریباً ساٹھ ستر سال سے یہ ادارہ دیگر زبانوں کے علاوہ زبان اردو میں عالمی خبروں اور ادب سے متعلق بے شمار مقبول پروگرام پیش کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ "دی وائس آف جرمنی"، دی وائس آف امریکہ" سے بھی اردو خبریں، فیچر، انٹرویو اور سفرنامے نشر کیے جاتے ہیں۔

جہاں تک ان ممالک کی اردو نوازی کا تعلق ہے وہاں اردو نشریات کے علاوہ علمی، ادبی، تدریسی اور ثقافتی کام بھی ہو رہے ہیں۔ روسی زبان میں اردو کا بیشتر سرمایہ موجود ہے۔ کئی اردو تخلیقات کو روسی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ سویت یونین کی جانب سے اردو ادیبوں کو ان کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں "سویت یونین نہرو ایوارڈ" سے نوازا جاتا ہے۔

جاپان کی اوسا اور ٹوکیو یونیورسٹی میں "فاران اسٹڈیز سنٹر" کے شعبہ اردو میں دکنی مخطوطات کی فہرست سازی کا کام ہوا ہے۔ اردو کے نمائندہ شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔

مسلم ممالک خصوصاً ترکی کی مایہ ناز یونیورسٹی" جامعہ القراۃ" میں "ڈپارٹمنٹ آف ایسٹرن لینگویجز اینڈ لٹریچر" کے تحت اردو شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ جہاں درس و تدریس کے ساتھ تحقیق کا بھی کام ہوتا ہے۔

خلیجی ممالک میں اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے، اس کو سیکھنے کے خواہش مند حضرات کے لیے "قاہرہ کا انٹرنیٹ" "تاج محل اردو سنٹر برائے ترجمہ اور صحافتی و تعلیمی خدمات" کا بھی اردو کے فروغ میں اہم رول ہے۔

قطر، عمان اور جدہ میں بھی اردو زبان و ادب کے شیدائیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قطر میں ایک انجمن "مجلسِ فروغِ اردو" قائم ہے جو ہر سال اردو قلم کاروں کو سالانہ "عالمی فروغِ اردو ایوارڈ" دیتی ہے۔ جو اردو کا سب سے بڑا ایوارڈ ہے۔

عمان میں "اقبال اکاڈمی" اردو کی ترقی و ترویج میں مسلسل کوشاں ہے۔ شہر جدہ تو آج کل اردو کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یہاں بیشتر اسکولوں میں اردو "زبانِ اوّل" کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی ہے۔ اس لیے یہاں ہندوستان کی دو جامعات "مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی اور اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کے مرکز بھی قائم کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کئی اردو انجمنیں جیسے انڈین کلچر سوسائٹی، مسلم ایجوکیشن سوسائٹی، اردو اکادمی، انڈیا فورم وغیرہ خانگی طور پر اردو کے فروغ اور تحفظ کے لیے کام کر رہی ہیں۔

نیپال کی ڈھائی کروڑ آبادی میں تقریباً پچیس 25 لاکھ افراد اردو بولتے، سمجھتے، اور اکثر پڑھتے اور لکھ بھی لیتے ہیں۔ "نیپال اردو کلب" اردو کی ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ یہاں ایک سو ایک زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جس میں اردو کو دسواں مقام حاصل ہے۔

امریکہ میں تین برسوں کے دوران "امریکائی اردو تنظیموں نے زبان اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں "غالب اکاڈمی" ایک فعال تنظیم اردو کے پروگرام منعقد کرتی ہے۔ برطانیہ میں بھی اردو کا چلن عام ہے۔

مذکورہ انجمنوں و اداروں کی خدمات سے صرفِ نظر عالمی سطح پر اردو

اخبارات ورسائل کی اشاعت سے بھی اردو زبان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں تو اردو اخبارات ورسائل کی تعداد تقریباً تین ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ جس میں 405 صرف روزنامے ہیں۔ ان رسائل وجرائد میں مشہور ہندسماچار، اخبار مشرق، راشٹریہ سہارا، انقلاب، سیاست، منصف، اعتماد، عظیم آباد ایکسپریس، ہماری زبان، زرین شعاعیں، آفتاب، سالار، رہنمائے دکن، کے بی این ٹائمز، انقلاب دکن وغیرہ۔

پاکستان سے "جنگ، نوائے وقت، ملت، اردو نیوز، سیپ، اوراق، فنون، بادبان، تشکیل جیسے بے شمار اخبارات ورسائل شائع ہوتے ہیں۔ امریکہ میں ہندوستان سے امریکی سفارت خانہ کی جانب سے انگریزی رسالہ "SPAN" کا اردو ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔

بریڈ فورڈ سے "آئینہ" لندن سے پرواز، شہزاد، مسکان، اردو پوائنٹ، صدا اور ورشا اخبار ورسائل اردو زبان میں شائع ہو رہے ہیں۔ جدہ کی سرزمین سے کئی اردو روزنامے اور رسائل جیسے "اردو نیوز، روزنامہ الشرق، اور ہفتہ وار "سمندر پار گو" وغیرہ۔ نیویارک سے "اردو نیوز، اردو خبریں، اردو ٹائمز، آزاد، عوام، ایشیا، صدائے پاکستان، ماہنامہ انکشاف، واشنگٹن سے "اردو پوائنٹ، کینیڈا سے ہفتہ وار "لیڈر" وغیرہ اردو رسائل و اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ جس سے عالمی سطح پر اردو زبان و ادب کی اہمیت اور مقبولیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو وہ پھول ہے جس کی خوشبو سارے عالم میں مہک رہی ہے۔

اس کے علاوہ آج عالمی سطح پر اردو کے کئی سائٹس اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان میں چند ایک، "اردو جینس ڈاٹ کام، اردو ڈکشنری ڈاٹ کام، اردو اسٹورلیس، اردو لٹریچر اردو ناولس، اردو کتاب گھر، اردو اسلامک سائنٹس وغیرہ ہیں، اس کے علاوہ پاکستان کے مختلف چینلس پر دکھائے جانے والے اردو ڈراموں کو بھی یوٹوب (you tube) پر بہت زیادہ دیکھا جا رہا ہے۔ یوٹوب اور مختلف سائٹس پر اردو ڈراموں کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی مقبولیت سے جہاں عالمی سطح پر اردو زبان کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے وہیں یہ سائٹس اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو دنیا کے کسی بھی خطے میں اردو زبان و ادب سے محظوظ ہونے کے وافر مواقع فراہم کر رہے ہیں۔

بہر حال آج اردو زبان 21 ویں صدی میں ایک ایسے شاہراہ پر کھڑی ہے جہاں اس نے خود کو عصری تقاضوں سے بھی ہم آہنگ کر لیا وہیں زبان اور رسم الخط کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت مضبوط کر لی۔ اس سارے جائزے کے بعد ہم یہ فخر سے کہہ سکتے ہیں

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے

Dr. Ayesha Farheen
Lecturer B B Raza P.U. College
Gulbarga-585104 (Kamataka)

فرہنگ آصفیہ سے

آب بقا - (ف۔ ع) اسم مذکر۔ ( ) امرت۔ آب زندگانی۔ آب حیات یعنی وہ پانی جس کے پینے سے آدمی کبھی نہیں مرتا۔ حیات ابدی جو دوسری زندگی میں ہوتی ہے۔ پہلے لوگوں کا خیال ہے کہ بحر ظلمات میں ایک ایسا چشمہ ہے جس کا پانی پی لینے سے آدمی کبھی نہیں مرتا خضر علیہ السلام سکندر اعظم کے واسطے اس چشمہ کے رہنما بنے تھے۔ بعضے تو کہتے ہیں کہ سکندر وہاں پہنچا تو اس نے اس پانی پینے والوں کو دیکھا کہ لوتھ پوتھ پڑے ہیں، زندگی ہوتی نہ ہوتی برابر ہے۔ نہ تو مرتے ہی ہیں اور نہ جسم ہی کچھ کام دیتا ہے اس نے پہلے تو چلو میں پانی لیا۔ پھر اس کا اسی میں ڈال دیا۔ مگر خضر نے پی لیا۔ جو آج تک زندہ ہیں اور بعضوں نے لکھا ہے کہ اثنائے راہ میں خضر اور راستہ پر پڑ گئے اور سکندر اور راستہ ہو لیا۔ خضر تو اس چشمہ تک پہنچے اور اپنی مراد حاصل کی مگر سکندر اس نعمت سے محروم رہا۔ راہ ظلمت میں مبارک ہو مشقت خضر کو کون مرنے جائے آب زندگانی کے لیے۔

املتاس - ع۔ اسم مذکر۔ ایک بڑے درخت اور اس کی پھلی کا نام جسے فارسی میں خیار شنبر اور عربی میں فلوس کہتے ہیں۔ اس کا گودا ادویات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اور پھلی بہت بڑی اور لمبی ہوتی ہے۔ مزاجاً معتدل الحرارت بعض کے نزدیک اول درجہ میں گرم تر ہے املتاس کا گودا ملین سینہ ہے۔ طبیعت کو نرم کرتا اور جوش خون کو سکون دیتا ہے۔ نیز گرم ورموں کو تحلیل کرتا ہے اور مادۂ فاسد کا نہایت آسانی سے اخراج کرتا ہے۔ مقدار خوراک۔ تولہ سے۔ تولہ تک۔

شاہین فاطمہ زیبا

احتیاطی تدابیر: برائے خاتون خانہ

خواتین کے لیے گھر ایک ایسی پناہ گاہ ہے جس کے سائے میں وہ اپنے ارمانوں کو جگہ دیتی ہیں، جس کی چار دیواری میں وہ خود کو محفوظ سمجھتی ہیں۔ گھر اس کے خوابوں کی تعبیر ہوتا ہے۔ عورت اور گھر ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہے۔ اولاد کی دیکھ بھال ہو یا امورِ خانہ داری کی ذمہ داری خواتین جس خلوص ومحبت سے نبھاتی ہیں ٹھیک اسی خلوص سے وہ گھر کو بھی اپنے ہاتھوں سے سجاتی وسنوارتی ہیں۔ شاید وہ اسی لئے گھر کی ملکہ کہلاتی ہیں۔ گھر صرف فرنیچر، چھت یا چار دیواری سے نہیں بنتا بلکہ آپسی پیار، محبت اور بھروسے سے بنتا ہے۔

آج کے اس مسابقتی دور میں عورتیں بھی گھر سے باہر نکل کر گھریلو اشیا کی خریداری، کام کاج اور نوکری وغیرہ کرتی ہیں جس کے لئے انہیں گھنٹوں گھر سے باہر گزارنے پڑتے ہیں ایسے میں گھر سے باہر جاتے وقت قیمتی سامان، روپیہ پیسہ اور زیورات وغیرہ ہم ساتھ نہیں لے جاسکتے تو ایسے میں کونسی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں جس سے گھر سے باہر رہنے تک ہمارے گھر کی تمام چیزیں محفوظ رہیں۔ گھر میں سب سے زیادہ قیمتی شئے زیورات ہوتے ہیں۔ آج کل ہر الماری کے اندر چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوتے ہیں جسے تجوری کہا جاتا ہے اس کے اندر تمام زیور ایک ڈبے میں رکھ کر لاک کر دینا چاہئے۔ لاک ہوا یا نہیں اچھی طرح سے اطمینان کر لینا چاہئے اور دونوں چابیوں کو اپنے پرس میں جو آپ ساتھ رکھتی ہو اس کے اندر رکھنا چاہئے۔ آپ کے پاس جو پرس ہے اس کے اندر ایک چھوٹا سا پرس رکھیں جس میں آپ گھر کی تمام چابیوں کو ایک جگہ حفاظت سے رکھ سکیں۔ اسی طرح الماری کے ایک دوسرے لاکر میں روپیہ پیسہ حفاظت سے رکھیں جتنی ضرورت ہو اتنی ہی رقم ساتھ رکھیں، اس طرح سے آپ کے زیورات، روپے پیسے دونوں محفوظ ہو جائیں گے۔ اگر آپ کو کام کے سلسلے میں گھر سے 8 تا 10 گھنٹے باہر رہنا پڑتا ہے تو آپ سب سے پہلے روزمرہ کے کاموں کی منصوبہ بندی کرلیں جیسے باورچی خانہ میں پکانے کے لئے جو سامان درکار ہوتا ہے انہیں ترتیب وار رکھیں ہر سامان کے لئے جگہ مقرر کر دیں اس سے آپ کو چیزیں ڈھونڈنے کے لئے وقت نہیں لگے گا اور کام جلد ہوگا اور وقت کی بچت بھی ہوگی۔

باورچی خانے میں پکا ہوا کھانا اچھی طرح سے ڈھانک دیں اور جو چیزیں پکانے کے بعد بچ گئی ہوں انہیں فریج میں حفاظت سے رکھ دیں۔ اسی طرح باورچی خانے میں سگڑی اور گیس ہوتی ہے پکوان کے فوری بعد ریگولیٹر بند کرنے کی عادت ڈالیں اس سے آپ ایک بڑے حادثے سے بچ سکتی ہیں۔ گیس جلانے کے لئے آپ لائیٹر یا ماچس کا استعمال کرتی ہیں اور گھر میں اگر چھوٹے بچے ہوں تو وہ ماچس کو سلگانے کی ضرور کوشش کریں گے، اس لئے یہ تمام چیزیں ان کی پہنچ سے دور رکھیں تا کہ گھر میں کوئی حادثہ پیش نہ آئے۔ نہانے کے لئے ہیٹر اور گیزر کا استعمال ہوتا ہے چونکہ یہ چیزیں کرنٹ سے مربوط ہوتی ہیں، انہیں جلانے سے پہلے ضرور چیک کرلیں کہ ان کے کنکشن کھلے تو نہیں رہ گئے ہیں۔ اسی طرح جلتی ہوئی موم بتی اور گڈ نائٹ وغیرہ بھی رکھے جاتے ہیں ایسی چیزیں بچوں سے دور رکھیں۔ گھریلو خواتین سے زیادہ دقتیں اور پریشانی سروس کرنے والی خواتین کو پیش آتی ہے چاہے وہ خود کام کریں یا ملازمہ سے کروائیں، ایسے میں انہیں کام کی فکر کے ساتھ ساتھ ملازمہ پر بھی دھیان دینا ہوتا ہے۔ خواتین ہمیشہ ایک بات دھیان میں رکھیں گھر کی ملازمہ سے گھر کا کام اپنی نگرانی میں کرائیں۔ ملازمہ کے لئے ایسا وقت مقرر کریں کہ آپ کے

سامنے ہی گھر کا کام پورا کرلیں کیونکہ ملازمہ کے بھروسے پر ہم گھر اور بچوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ آئے دن اخبارات میں اور ٹی وی میں ہمیں ایسے واقعات پڑھنے اور دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ملازم یا ملازمہ گھر سے زیورات یا نقدی لے کر غائب ہوگئے۔

اگر آپ بچوں کو چھوڑ کر کہیں باہر جارہی ہوں تو گھر کے باہری حصے میں دروازہ اور ایک گیٹ دونوں ساتھ لگوائیں جاتے وقت باہر کا گیٹ لاک کر کے اندر کے دروازے کو کھلا چھوڑ دیں اور دو چابیاں رکھیں۔ بچوں کو تاکید کریں کہ چابی کسی غیر شخص کو نہ دیں اور نہ ہی دروازہ کھولیں جو بھی شخص آپ کے باہری دروازے پر آئے گا انہیں باہری گیٹ پر نظر آجائے گا اس سے آپ کے بچے اور گھر دونوں محفوظ رہیں گے۔ اگر آپ کے پاس ایک ہی داخلی دروازہ ہو تو دروازے کے بیچ دوربین لگائیں اس سے بھی آپ ہر آنے والے شخص کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہم بازار میں جاتے ہیں تو اکثر دکانوں پر سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے دکان مالک اپنے نوکر اور گاہکوں پر نظر رکھ سکتا ہے کہ دکان کے کس حصہ میں کیا ہو رہا ہے،

ایسے ہی کیمرے ہم گھروں میں نصب کر سکتے ہیں۔ اس سے بھی گھر کے باہر کون شخص ہے دیکھ سکتے ہیں یہ تھوڑا مہنگا لیکن بہت محفوظ طریقہ ہے۔

بہر حال گھر سے جب نکلیں گھر کے ہر کمرے کا جائزہ لیں۔ لائٹ گیس، سکوی بند ہے یا نہیں؟ الماری، تجوری لاک ہے یا نہیں؟ اسی طرح باورچی خانے میں ریگولیٹر، ماچس، موم بتی وغیرہ بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔ اس کے لئے ہمیں زیادہ وقت نہیں لگے گا، صرف آپ ہر کمرے میں جا کر ایک ایک منٹ یا پھر اس سے بھی کم وقت میں دیکھ سکتی ہیں لیکن ہمارے اس طرح کے اقدام سے ہم بہت سی مشکلوں سے اور حادثوں سے بچ سکتے ہیں۔ اس طرح کی احتیاط سے ہم اور ہمارا خاندان محفوظ رہے گا اور گھر سے باہر رہ کر بھی آپ بے فکر اور مطمئن رہ سکتی ہیں۔

Dr. Shaheen Fatema

Municipal Corporation School. No.1

Bashir Colony, Roshan Gate

Aurangabad-431001 (M.S)

فرہنگ آصفیہ سے

آبِ زمزم۔ ف + ع۔ اسم مذکر (آب + زمزم) مادّہ (زم) (۱) کھاری پانی۔ ململا پانی۔ (از مدّ القاموس) (۲) کعبہ کے کنویں کا پانی۔ اگرچہ یہ پانی ململا ہے مگر اس کا پینا نجات کا وسیلہ تصور کیا جاتا ہے۔

گیا جو اس کے کوچے میں وہ با چشمِ پُر آب آیا
حرم سے لاتے ہیں جس طرح زائر آبِ زمزم کا (ناسخ)

ترے عاشق کو ہے یوں خوشگوار آبِ دمِ خنجر
مسلماں کو لگے جس طرح شیریں آبِ زمزم کا (ذوق)

کہتے ہیں کہ جب بیوی ہاجرہ کے پیٹ میں حضرت اسماعیل پڑے تو حضرت ابراہیم ﷺ اپنی پہلی بیوی سارہ کو رشک نہ ہونے کے خیال سے انہیں مکّے کے میدان میں چھوڑ گئے۔ یہاں آکر حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو اس وقت ان کی والدہ کو نہایت تشنگی ہوئی اور پانی کے واسطے ادھر ادھر بلبلاتی پھریں۔ خدا کی شان، جس زمین پر حضرت اسماعیل پڑے ہوئے ٹانگیں مار رہے تھے ان کی ایڑیاں جو لگیں وہاں سے پانی رسنے لگا اور بعض لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت جبرئیل نے خدا تعالیٰ کے حکم سے اس زمین پر آکر ایک ایسا پر مارا کہ زمین کا پردہ پھٹ گیا اور پانی ابھر آیا۔ غرض جب وہ پانی ابلنے لگا تو آپ نے چاروں طرف سے مٹی روک کر اس پانی سے ارشاد فرمایا کہ (زم زم) یعنی تھم جا تھم جا۔ جب سے اس متبرک چشمے کا نام زمزم ہو گیا۔ چونکہ یہ حضرت اسمعیل علیہ السلام کا ایک معجزہ ہے اور خانہ کعبہ میں بھی اس کا پانی صرف ہوا ہے اس سبب سے اہل اسلام اس کی بڑی عزت کرتے اور دور دور لے جاتے ہیں، بلکہ مرتے وقت اس پانی کا منہ میں چوانا باعثِ نجات تصور کرتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ اس چشمہ میں جنت کی سوت ہے اور از روئے حدیث یہ کل امراض کے واسطے آبِ شفا ہے۔ مشہور ہے کہ آدمی جس چیز کی نیت کر کے اس پانی کو پیتا ہے اسی کا مزہ اس کو ملتا ہے۔

بعضوں نے شہد کا مزا پایا ہے بعضوں نے دودھ کا ذائقہ لیا ہے اس کے علاوہ یہ پانی غذا کا کام بھی دیتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اردو شاعری میں وطن دوستی

فردوس مسرت

آریاؤں سے لے کر مسلمانوں تک جتنی قومیں یہاں آئیں اور یہاں رس بس گئیں اُن کے لیے ہندوستان اپنا وطن بن گیا۔ ہندوستانی تہذیب اردو شاعری کی رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ کا آئینہ ہے۔ ہر سیاسی وسماجی واقعہ اردو شاعری کو از بر ہے۔ کوئی منزل اور کوئی موڑ ایسا نہیں جہاں اردو شاعری نے اپنے ممالک کا ساتھ نہ دیا ہو۔ آزادی کی جنگ شعرا نے اپنے قلم سے لڑی ہے۔ اردو شعرا نے ہندوستان کی عظمت کے ترانے گائے ہیں۔ اردو نے ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے گلے لگایا ہے۔

درباروں میں فارسی کا چلن رہا لیکن بیوپاروں، سادھوؤں، سنتوں، صوفیوں، کاریگروں، فوجیوں سرکاری حاکموں کے وسیلے سے اردو زبان شمال میں سندھ و پنجاب سے بہار تک اور جنوب میں کنیا کماری تک پھیل گئی۔ الگ الگ قوموں اور ان کی زبانوں سے اس کا میل ملاپ بڑھتا رہا۔ تصوف اور بھگتی تحریک کے ذریعہ مذہب کی تفریق مٹ گئی۔ ایک طرف تصوف کا اثر بھگتی تحریک پر پڑا تو دوسری طرف تصوف بھی ہندوازم سے متاثر ہوا۔

دکن اور شمالی ہندوستان کے بھی شاعروں کے یہاں ہندوستانیت رچی بسی ملتی ہے۔ دکنی شاعری قلی قطب شاہ کے دیوان میں ہندوستانی موسم، تہواروں، رسم و رواج اور ہندو دیو مالا کے حوالے ملتے ہیں۔ اردو شاعری کے بھی اصناف غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ اور یہاں تک مرثیوں میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب سمائی ہوئی ہے۔

اردو شاعری نے ہر زمانے میں مذہب کے فرق کو مٹا کے ایکتا اور بھائی چارہ کا پیغام دیا ہے۔ جدید اردو شاعری میں حب الوطنی اور آزادی کی جنگ خاص موضوع رہا ہے۔ اردو شعرا نے ہندوستان کی مٹی سے محبت کی اور وطن کی محبت میں انھیں یہاں کے موسم، تہوار، ندیاں، پہاڑ، پھل، پھول، کھیل کود کو اس طرح پیش کیا کہ مکمل ہندوستان کی تصویر نظر آتی ہے۔

ان کی شاعری نے ہندوستان کی تاریخ کو جذب کر کے ان تمام شخصیتوں کو اپنا ہیرو بنایا جو مشترکہ تہذیب اور ہندوستان کی سالمیت کی علامت تھے۔ اردو شاعری کو ہندوستان کی سچی روح کا مظہر کہا جاسکتا ہے۔ یہاں کی سرزمین سے وابستہ قصے، کہانیاں، مذہبی و سیاسی رہنماؤں کی عزت اور تعظیم میں بھی نظمیں لکھی ہیں۔ انسانیت بڑا دھرم ہوتا ہے اردو شاعری میں مسلمان شاعروں نے ہولی، دیوالی اور بسنت پر بہت نظمیں لکھی ہیں وہیں ہندو اور سکھ شاعروں نے اردو میں اسلامی تہواروں پر نظمیں لکھی ہیں۔

اردو شعرا کو ہندوستان سے عشق رہا اور ہندوستان سے وابستہ ہر نکتہ پر ان کی شاعری ملتی ہے۔ اردو شاعروں نے ہندوستانی زندگی کی تہذیبی علامتوں کو محور فکر و نظر بنایا۔ مناظر فطرت کو شاعری میں جگہ دے کر اسے اکثر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہندوستانیت مکمل طور پر برقرار رہتی ہے۔

اردو شاعری کی یہ روایات سیکولر تصورات پر مبنی تھیں جن میں انسان دوستی، وسیع المشربی، رواداری، ایک دوسرے کے جذبات کا احترام، ہندوستانیت وطن سے محبت، مشترکہ کلچر کی تشکیل و تعمیر اور مشترکہ غلامی سے نجات پانے کی تمنا شامل رہی۔

کچھ ایسے شعرا ہیں جن کے یہاں قوم اور وطنی شعور کی باقاعدہ نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ ثاقب، عزیز، آرزو اور یاس کے نام قابل ذکر ہیں۔

یاس عظیم آبادی کے یہاں وطنیت کا باقاعدہ تصور ملتا ہے۔ خاک

وطن سے الفت کا یہ شدید اظہار اردو شاعری کی روایت رہی ہے۔ یاس کے یہاں اس کا تصور اس طرح ملتا ہے۔

وطن کی ہے ہوا سر میں، وطن کی خاک دامن میں
گریباں چاک کر لیتا ہوں یاد دوست و دشمن میں

ساغر اپنی نظم 'رام' میں ہندوستان سے محبت کا اظہار تو کرتے ہی ہیں ساتھ ہی رام سے عقیدت کا اظہار بھی ہے۔

بھارت پیارا راج دلارا
کوشلیا کی آنکھ کا تارا

ہندوستانی تاریخ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جسے اردو شعرا نے اپنے دائرہ معیار میں قید نہ کیا ہو۔ اردو شاعری مستند تاریخ کتب بن گئی ہے۔ مختلف قوموں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔ وحید الدین سلیم کی نظم 'آریوں کی پہلی آمد ہندوستان میں' میں ایک طرف ہندوستان کی عظمت کا تصور بھی ہے اور دوسری طرف تہذیبی دور کے آغاز کی نشان دہی بھی نظر آتی ہے۔

وہ دیکھ کر موجیں رقص کناں ہیں سطح زماں پر گنگا کی
نو وارد آریہ حیرت میں ہیں دیکھ کے شان اس دریا کی

اے آریو آؤ قدم رکھو ان حسن بھرے گلزاروں میں
جنت کے مزے لوٹو گے صدا اس پاک زمین کی بہاروں میں
تم گنگ و جمن کے کناروں پر شہر اپنے نئے آباد کرو
گاگا کے بھجن کر کر کے ہون ہو جاؤ مگن دل شاد کرو

بیسویں صدی میں سرور جہاں آبادی، اقبال، چکبست، شبلی اور اکبر کی شاعری کا مقصد ہندوستان میں قومیت اور وطنیت کے شعور کو جدید علوم کی روشنی میں استوار کرنا تھا۔ ان شعرا نے حب وطن کا صحیح شعور بیدار کیا، فرقہ واریت کے خلاف جنگ کی اور ہندوستان میں جذبۂ آزادی کو عام کیا۔

حالی، آزاد اور اسماعیل میرٹھی نے حب وطن کا جو تصور پیش کیا تھا اسے اقبال نے زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ علامہ اقبال کی نظم 'ہمالہ' سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے وطن ہندوستان پر انھیں کتنا فخر ہے۔ 'ہمالہ' کو فصیل کشور ہندوستان' اور پاسبان اپنا ہے تو' دیوار ہندوستان ہے تو' کہا ہے۔ وطن کی محبت میں ہی ہر قسم کی فتنوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔

واعظ کرتا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

دور بین نگاہیں انھیں آگاہ کرتی ہیں کہ برا وقت آنے والا ہے۔

ہمت اور حوصلے سے ان مسائل کو سلجھاتا ہے۔ ہندوستان کی حالت پر وہ آنسو بھی بہاتے ہیں۔ ہندوستان کی خوابیدہ قوم کو جھنجھوڑتے ہیں یہ ان کی وطن دوستی کا ثبوت ہے۔ وطن کی فکر کرنا اس مصیبت آنے والی ہے۔

تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال نے مختلف انداز میں وطن دوستی کو اپنے کلام میں جگہ دی اور ترانۂ ہندی لکھ کر تو انھوں نے اپنی حب الوطنی کو معراج پر پہنچا دیا۔

سارے جہاں سے اچھا یہ ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

ان اشعار میں جذبۂ حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ چاہے کتنا بھی عرصہ گزر جائے ان اشعار کی عظمت کم نہیں ہو سکتی وطنیت کا تصور روشن اور تابناک ہے۔ وطن سے عقیدت، محبت اور اس کی تعظیم کے جذبے سے اس قدر سرشار ہیں کہ ہندوستان کی خاک کا ہر ذرہ انھیں دیوتا نظر آتا ہے۔ وطن کی مٹی کو انھوں نے معبود کا درجہ دے دیا ہے۔

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اس شعر میں وطن دوستی کے جذبے کی انتہا ہے۔ ان کی نظر میں بہتر یہ ہے کہ ہر ہندوستانی، وطن کی مٹی کو دیوتا کی طرح پوجتا رہے۔ مختلف مذہبوں سے تعلق رکھنے کے باوجود ہندوستان کی خاک قدر مشترک رکھتی ہے۔

'ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' اس نظم میں علامہ اقبال ہندوستان کی تاریخ کے اہم واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عظیم تاریخی روایت رکھنے والا ہندوستان میرا وطن ہے ع

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

کہتے ہوئے جیسے ان کا دل شاد ہو جاتا ہے۔ وطن کے عظیم اور پر وقار ہونے کا احساس ان کے رگ رگ میں سما جاتا ہے۔ اس طرح روشن اور تابناک نمونے ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ آخر تک انھوں نے فخر کے ساتھ ہندوستانی ہونے کا اعلان کیا۔ اقبال کے پاس مسلمانوں کا محدود تصور نہیں تھا۔ پورا ہندوستان ان کی فکر کا محور تھا۔

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے

یہاں تک نظم شعاعِ امید میں وہ صاف طور پر کہہ دیتے ہیں کہ میری امیدوں کا مرکز بھی ہندوستان ہے اور اپنے اشکوں سے اس سرزمین کو میں نے سیراب کیا ہے، جب تک ہندوستانی خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہو جائیں میں ان کے لیے کوشاں رہوں گا۔ اپنے ان خیالات کا اظہار انھوں نے ایک شعاع کے ذریعہ کیا ہے اور آخر تک امید کا دامن تھامے رکھتے ہیں۔

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کی اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

حب الوطنی اور خوشحالی کے تصورات سے لبریز شاعری لیے ہوئے سرور جہاں آبادی انیسویں صدی کے آخر میں منظرِ عام پر آتے ہیں۔ انھوں نے چکبست اور جوش کے لیے راہ ہموار کی۔ ان کی شاعری نے ناقدین کو متوجہ کیا ہے۔ عبدالقادر سروری ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

'وہ حقیقی ہندوستانی شاعر ہے ان میں شاعرانہ تنگ
خیالی یا مذہبی تعصب نام کو بھی نہیں ہے۔'

ڈاکٹر حکم چند نیر نے بھی ان کی نظم 'پھولوں کا کنج' کی بھرپور تعریف کی ہے۔ نظم 'پھولوں کا کنج' میں انھوں نے ایک ایسے ہندوستان کا تصور پیش کیا ہے۔ جس میں گلچیں کا ڈر ہو گا نہ صیاد کا کھٹکا۔

پھولوں کا کنج دلکش بھارت میں اک بنائیں
حب وطن کے اس میں پودے نئے لگائیں
حب وطن کا مل کر سب ایک راگ گائیں
لہجہ جدا ہو گرچہ مرغانِ نغمہ خواں کا

سرور جہاں آبادی کی پوری شاعری، حب الوطنی، متحدہ قومیت کے جذبات سے مملو ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے اہم تاریخی واقعات کا ذکر شاعری میں کیا ہے اور ان کی نظموں کے عنوانات سے ہی وطن دوستی کا اظہار ہوتا ہے۔ نظم 'عروسِ حب وطن' اور 'خاکِ وطن' اردو شاعری میں روایت بن گئی۔ چکبست نے اسی روایت کو آگے بڑھایا۔ چکبست نے 'خاکِ ہند' نامی نظم لکھی۔ ان کی شاعری ہندوستانیت قومی یکجہتی اور حب الوطنی کی آئینہ دار ہے۔ انھیں ہندوستان کی جبین سے نورِ حسنِ ازل عیاں نظر آتا ہے۔ 'وطن کا راگ' نظم کے ایک ایک شعر میں ہندوستان کی عظمت کو پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان کی زمین کے بارے میں کہتے ہیں ؎

زمینِ ہند کے رتبے میں عرش اعلا ہے

وطن دوستی اس دور کے شعرا کا ایمان ہے لیکن یہ ہر ایک کی شاعری میں الگ الگ انداز سے ظاہر ہوئی ہے۔ انگریزوں اور انگریزی تہذیب سے نفرت بھی ہندوستان سے محبت کی صورت ہے۔ اکبر الہ آبادی کی نظر میں ہندوستانی تہذیب مختلف قوموں کو رشتہ وحدت میں جوڑے ہوئے تھی انھیں ڈر تھا کہ مغربی تہذیب کی آمد سے قدیم ہندوستانی تہذیب کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

مزاح نگار اور طنز نگار شعرا کا بڑا گروہ اکبر سے متاثر رہا۔ بیسویں صدی کی ابتدا کے ساتھ اردو شعرا کا قابلِ قدر گروہ وطن دوستی کے نغموں سے اردو زبان کو مالا مال کرتا ہے۔ حب الوطنی ہی ان کی نظموں کا مرکزی خیال ہے۔ اس گروہ میں جوش، ساغر نظامی، جمیل مظہری، فراق، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، احسان دانش، تلوک چند محروم، جگت موہن لال رواں، سیماب اکبر آبادی، روش صدیقی اور آنند نرائن ملا کے نام اہم ہیں۔

حسرت موہانی اور محمد علی جوہر نے جذبۂ عمل بیدار کرنے کی کوشش کی اور انگریزی حکومت کے استبداد کے خلاف آواز اٹھائی۔ ظفر علی خان کی شاعری کے خدوخال ہندوستان سے عشق کی شکل میں ظاہر ہوئے۔

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے

ظفر علی خاں قومی یکجہتی کے علم بردار، اور قومیت کے پرستار تھے۔ انھوں نے اس دور کے سلگتے ہوئے موضوعات پر نظمیں لکھی۔ تلوک چند محروم، شاد عظیم آبادی، مہاراج بہادر برق، جگت موہن لال رواں اور سورج نرائن مہر کون سے ایسے شاعر تھے جن کا کلام وطن کی محبت سے معمور نہ ہو۔ شاد عظیم آبادی نے 'مادرِ ہند' مثنوی لکھی۔ ہندوستان کو ماں کا بلند مرتبہ دیا۔ اس کو ایشیا کی جان کہا اور اسے فردوسِ بریں سے بہتر بتایا۔

اک ملک جو ایشیا کی ہے جاں
فردوسِ بریں ہو جس پہ قربان
مشہور تھا فیضِ عام اس کا
تھا مادرِ ہند نام اس کا

ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے مختلف عوامل سے گزرتے ہوئے اردو شاعری ارتقائی منزلیں طے کرتی گئی۔ جوش ملیح آبادی کی شاعری اسی ماحول کی پروردہ ہے۔ ان کی ابتدائی دور کی نظموں میں ہندوستانیت کی فضا بھرپور ہے۔ وطن کی محبت کا تصور 'اے وطن، پاک وطن، روحِ رواں احرار' جیسی نظموں میں ملتا ہے۔

ایک دن تو کی لکھوں گا کتاب زر فشاں
ثبت ہوگا جس کی زریں جلد پر ہندوستاں

جوش کے معاصرین میں سیماب اکبر آبادی، اثر لکھنوی، جمیل مظہری نے پر جوش ترانے لکھے۔ جمیل مظہری نے خوبصورت نظم' بھارت ماتا' میں ہندوستانی تاریخ کو پیش کیا ہے۔

او ماتا بھارت ماتا
تجھ پہ خدا کی رحمت ماتا
شہد کی نہریں دودھ کی دھاریں
گودی میں جنت کی بہاریں

ہندوستان کی تاریخ مختلف ادوار سے گزرتی رہی، اردو شاعری نے ہندوستانی قدروں، مشترکہ کلچر وتہذیب کے تاریخی تسلسل کی کئی برسوں حفاظت کی اردو شاعری کی اس خدمت کو فراموش کرنا اس کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔

ملک کی آزادی پر اردو شاعروں نے خوشی کے ترانے گائے، جان نثار اختر نے جشنِ آزادی، سراج لکھنوی نے یوم آزادی، اقبال احمد سہیل نے مبارک باد آزادی، آنند نرائن ملانے آہی گیا، ساغر نظامی نے اے صبح وطن، امین سلونوی نے اعلانِ آزادی، اسرار الحق مجاز نے جشنِ آزادی، سکندر علی وجد نے آفتاب تازہ اور قاضی سلیم نے میرے آزاد وطن لکھی۔ قاضی سلیم کہتے ہیں۔

میرے آزاد وطن میری امیدوں کے چمن
تو میرا خواب ہے اور خواب کی تعبیر بھی ہے
آج اے جانِ جہاں تو نے پکارا ہے مجھے
تیری آواز میں جادو بھی ہے تاثیر بھی ہے

یہاں تک کہ تقسیم ملک کے بعد کئی اردو شعرا کا وطن پاکستان قرار پایا لیکن وہ ہندوستان کی یادوں کو اپنے دل سے نہ بھلا پائے۔ تیغ الہ آبادی پاکستان میں لکھتے ہیں۔

میرے محبوب دیس کی گلیوں
تم کو اور اپنے دوستوں کو سلام

وحیدہ نسیم ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلی گئیں لیکن وہ اپنے دستخط سے ہندوستان کا نقشہ بنا کر وطن دوستی کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ آزادی اور تقسیم کے بعد بھی اردو شاعری نے وطن دوستی اور یکجہتی کی روایت کو اسی طرح قائم رکھا اور آج بھی اسی راہ پر گامزن ہے۔

(ماخوذ از توقیر ادب، ڈاکٹر مسرت فردوس)

فرہنگِ آصفیہ سے

براتِ عاشقاں برشاخِ آہو ۔ ف۔ ضرب المثل(۱) یہ فارسی زبان کی ضرب المثل ہے۔ جو یہاں تین طرح سے بولی جاتی ہے۔ اول طرح تو یہی ہے جو اوپر لکھی گئی۔ دوسری۔ تیسری حسب ذیل ہے۔ یعنی برات بر بیخ و برات بسوئے بیخ۔ اسے عدم وثوق۔ بے ثباتی۔ ناامیدی۔ نامرادی لاحاصل و بے سود کے موقع پر بولتے ہیں

بنوعِ خوشدلی بہ کردہ از عالم کہ پنداری
بطِ مینا نے نے برشاخِ آہو آشیاں دارد (تاثیر)

(۱) جھوٹ بولنے اور جھوٹا وعدہ کرنے پر بھی وہاں اسکا اطلاق ہوتا ہے

(چونکہ ہرن ایک چنچل۔ اچپل بے چین۔ مضطرب المزاج اور نچلا نہ رہنے والا جانور ہے۔ جس سے اسکے سینگ پر بھی کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ اس وجہ سے عدم حصول مراد اور وعدہ دروغ کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں۔ عدم استقلال و عدم استحکام سے بھی مراد لی جاتی ہے چنانچہ استاد ذوق نے بھی اس مثل کو اردو شعر میں باندھا ہے اور اثنائے گفتگو میں بھی بطریق تمثیل یہ کہاوت زبان پر آجاتی ہے حضرت ذوق کا شعر ہے

سوالِ بوسہ کو ٹالا جواب چینِ ابرو سے
براتِ عاشقاں بر شاخِ آہواس کو کہتے ہیں (ذوق)

یعنی ہم نے جو اپنے محبوب سے بوسہ کا سوال کیا تو اس نے تیوری چڑھا کر اور چیں بجبیں ہو کر ظاہر کر دیا کہ تمہاری یہ مراد بر آنے والی نہیں ہے ہم سے ایسی توقع نہ رکھنا۔ پس شاعر یہ کہتا ہے کہ ہمارے حق میں یہ جواب ایسا ملا کہ جسے ''براتِ عاشقاں برشاخِ آہو'' پر محمول کر سکتے ہیں گویا ہماری یہ درخواست لاحاصل بے سود اور فضول ٹھہری۔

گذشتہ سے پیوستہ

خواتین کے خلاف خانگی تشدد کے خاتمے کا قانون

خواجہ عبدالمنتقم

(ب) جہاں حمل 12 ہفتوں سے زیادہ کا ہو لیکن 20 ہفتوں سے زیادہ کا نہ ہو، اگر کم از کم 2 میڈیکل پریکٹشنروں کی نیک نیتی پر مبنی یہ رائے ہو کہ حمل کے جاری رکھنے سے حاملہ عورت کی جان جانے یا اس کی جسمانی یا ذہنی صحت کو شدید مضرت پہنچنے کا خطرہ ہے یا پیدا ہونے والے بچے کو اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ وہ جسمانی یا ذہنی بے اعتدالی میں مبتلا ہو کر شدید معذوری کا شکار ہو جائے گا۔

تشریح-1: جب حمل زنا بالجبر کے سبب ٹھہرا ہو تو یہ قیاس کیا جائے گا کہ اس سے حاملہ کی ذہنی صحت کو شدید مضرت پہنچے گی۔

تشریح-2: بچوں کی تعداد کو محدود کرنے کے لیے استعمال کیے گئے کسی آلے یا طریقہ کار کے ناکام ہو جانے کے سبب حمل ٹھہرنے کی صورت میں یہ قیاس کیا جائے گا کہ اس سے حاملہ کی ذہنی صحت کو شدید مضرت پہنچے گی۔

(3) اس بات کا تعین کرنے کے لیے کہ ذیلی دفعہ (2) کی روشنی میں استقاط حمل نہ کرنے کی صورت میں حاملہ کی صحت کو مضرت پہنچنے کا امکان ہے حاملہ کی حقیقی صورت حال اور اس کے چہار طرفہ ماحول کو ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہیے۔

(4) (الف) کسی بھی 18 سال سے کم عمر کی عورت یا 18 سال سے زیادہ کی عورت کا، جو دماغی اعتبار سے معذور ہو، تب تک خاتمۂ حمل نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اس کے ولی سے تحریری طور پر ایسا کرنے کی رضامندی حاصل نہ کر لی جائے۔

(ب) فقرہ (الف) میں کی گئی توضیح کے ماسوائے، خاتمۂ حمل تب تک نہیں کیا جائے گا جب تک کہ حاملہ عورت اس کے لیے اپنی رضامندی ظاہر نہ کر دے۔

-4 اس دفعہ کے مطابق خاتمۂ حمل سرکار کے ذریعے قائم کیے گئے یا چلائے جانے والے یا دیگر کسی ایسے مقام پر کیا جائے گا جس کی حکومت صراحت کرے گی۔

باب-8

دوران حمل تشخیص جنس سے متعلق قانون

ہماری پارلیمنٹ نے یہ قانون ہمارے ملک کی آبادی میں مرد و زن کے تناسب میں توازن برقرار رکھنے اور لڑکیوں کے پیدائش سے قبل ہی استقاط حمل کے ذریعے مار دینے جیسی سماجی برائی کو روکنے کے لیے بنایا ہے۔

دوران حمل تشخیص جنس کی تکنیک

(ضابطہ بندی اور انسداد استعمال بیجا) ایکٹ، 1994

(The Pre-Natal Diagnostic Techniques (Regulation and Prevention of Misuse) Act)

(ایکٹ نمبر 57 بابت 1994)

کچھ اہم دفعات

-6 اس دفعہ کے مطابق کوئی بھی جینیٹک کونسلنگ سینٹر یا جینیٹک لیبوریٹری یا جینیٹک کلینک قبل از پیدائش جنس کی تشخیص کے لیے کسی تکنیک جس میں الٹرا سونوگرافی بھی شامل ہے کا نہ تو استعمال کرے گا اور نہ کرائے گا۔

اس کے علاوہ کسی بھی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ اس قسم

کا عمل کرے یا کرائے۔

22- کسی بھی شخص، تنظیم، جینیٹک کونسلنگ سینٹر یا جینیٹک لیبوریٹری یا جینیٹک کلینک کو اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ قبل از پیدائش جنس کی تشخیص اپنے ادارے میں ہونے کی بابت کسی بھی طرح کا اشتہار دے یا تشہیر کرے۔ جو کوئی بھی ایسا کرے گا اسے 3 سال تک کی قید کی سزا دی جاسکتی ہے اور اس پر 10 ہزار روپے تک کا جرمانہ کیا جاسکتا ہے۔

باب-9

قومی خواتین کمیشن کا قیام

خواتین کے ساتھ ہونے والی مختلف زیادتیوں کو روکنے کے لیے ضروری اقدامات کرنے، موجودہ قوانین کا جائزہ لینے اور قوانین میں ترمیم کرنے یا نئے قوانین کی تجویز پیش کرنے جیسے امور کے لیے قومی کمیشن برائے خواتین ایکٹ، 1990 کے تحت یہ کمیشن بنایا گیا ہے۔ یہ ایک فعال کمیشن ہے اور اپنی تشکیل سے تاہنوز اپنے میدان میں سرگرم عمل رہا ہے۔ حال ہی میں مرکزی حکومت نے اس کمیشن کو سول عدالت کا درجہ دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ اس ایکٹ کا مکمل متن درج ذیل ہے:

قومی خواتین کمیشن ایکٹ 1990

(The National Commission for Women Act)

1990 کا ایکٹ نمبر 20

ایکٹ تاکہ خواتین کے لیے قومی کمیشن مرتب کیا جائے اور اس سے متعلق یا ضمنی امور کی نسبت توضیع کی جائے۔

پارلیمنٹ جمہوریہ بھارت کے اکتالیسویں سال میں حسب ذیل قانون وضع کرتی ہے۔

باب-1

ابتدائیہ

1- مختصر نام وسعت اور نفاذ۔ (1) اس ایکٹ کا مختصر نام قومی خواتین کمیشن ایکٹ 1990 ہے۔

(2) ماسوائے ریاست جموں وکشمیر کے اس کا اطلاق پورے بھارت پر ہوگا۔

(3) یہ اس تاریخ سے نافذ ہوگا جو مرکزی حکومت سرکاری گزٹ میں اعلان نامے کے ذریعہ مقرر کرے۔

2- تعریفات۔ اس ایکٹ میں تاوقتیکہ سیاق عبارت اس کے خلاف ہو:-

(الف) "کمیشن" سے مراد ہے دفعہ 3 کے تحت تشکیل دیا گیا قومی کمیشن برائے خواتین؛

(ب) "رکن" سے مراد ہے کمیشن کا رکن اور اس میں رکن سکریٹری بھی شامل ہے۔

(ج) "مقررہ" سے مراد ہے اس ایکٹ کے تحت بنائے گئے قواعد سے مقررہ۔

باب - 2

قومی خواتین کمیشن

3- قومی خواتین کمیشن کی تشکیل۔ (1) مرکزی حکومت ایک جماعت تشکیل دے گی جسے قومی خواتین کمیشن کہا جائے گا جو ایسے اختیارات کا استعمال کرے گا اور ایسے کارہائے منصبی انجام دے گا جو اسے اس ایکٹ کے تحت تفویض اور سپرد کیے گئے ہوں۔

(2) کمیشن مندرجہ ذیل اشخاص پر مشتمل ہوگا۔

(الف) ایک چیئر پرسن جو خواتین کے مفادات کا پابند ہوگا جسے مرکزی حکومت نامزد کرے؛

(ب) پانچ اراکین جنھیں مرکزی حکومت قابلیت، دیانت اور باحیثیت والے ایسے اشخاص میں سے نامزد کرے جنھیں قانون یا قانون سازی، مزدوروں کی انجمن سازی، ایسی صنعت یا تنظیم کی انتظامیہ جو خواتین کی ملازمتی صلاحیت بڑھانے کی پابند ہو، خواتین کی رضا کارانہ تنظیموں، (جس میں خواتین سرگرم اراکین شامل ہیں) انتظامیہ، اقتصادی ترقی، صحت، تعلیم یا سماجی بہبود کا تجربہ حاصل رہا ہو۔

لیکن ہر ایک میں سے کم از کم ایک رکن ان اشخاص میں سے ہوگا جن کا تعلق بالترتیب درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں سے ہو،

(ج) ایک رکن سکریٹری جسے مرکزی حکومت نامزد کرے، جو......

(i) انتظام، تنظیمی ڈھانچے یا سماجیاتی تحریک کے میدان میں ماہر ہو؛ یا

(ii) کوئی افسر جو یونین یا آل انڈیا سروس کی سول سروس کا رکن ہو یا یونین کے تحت مناسب تجربے کے ساتھ سول سروس کا عہدہ رکھتا ہو۔

4- چیئر پرسن اور اراکین کی میعاد عہدہ اور شرائط ملازمت۔ (1) چیئر پرسن اور ہر ایک رکن، زیادہ سے زیادہ تین سال کی ایسی مدت کے لیے عہدہ دار رہے گا جس کی مرکزی حکومت اس بارے میں

صراحت کرے۔

(2) چیئرپرسن یا رکن (رکن سکریٹری کے سوا جو یونین کے سول سروس یا آل انڈیا سروس کا رکن ہو یا یونین کے تحت سول عہدے دار ہو) کسی بھی وقت چیئرپرسن یا جیسی بھی صورت ہو، رکن کے عہدے سے تحریری طور پر اور مرکزی حکومت کے نام اپنا استعفیٰ بھیج سکتا ہے۔

(3) مرکزی حکومت کسی شخص کو ضمن (2) میں محولہ چیئرپرسن یا رکن کے عہدے سے ہٹائے گی، اگر وہ شخص۔

(الف) جو بے ادا دیوالیہ ہو جائے؛

(ب) کسی ایسے جرم کا مجرم قرار دیا جائے اور اسے قید کی سزا دی گئی ہو، جس میں مرکزی حکومت کی رائے میں اخلاقی بدچلنی شامل ہو،

(ج) جو مخبوط الحواس ہو جائے اور اسے کسی عدالت مجاز نے ایسا قرار دیا ہو،

(د) جو فعل کرنے سے انکار کرے یا فعل کرنے کے قابل نہ رہے،

(ہ) کمیشن سے غیر حاضری کی اجازت حاصل کیے بغیر، کمیشن کے تین مسلسل اجلاسوں سے غیر حاضر رہے، یا

(و) مرکزی حکومت کی رائے میں چیئرپرسن یا رکن کے عہدے کا اس نے ناجائز استعمال کیا ہو جس سے اس شخص کا اس عہدہ پر رہنا مفاد عامہ کے لیے نقصان دہ ہو:

لیکن کسی بھی شخص کو اس فقرے کے تحت اس وقت تک نہیں ہٹایا جائے گا جب تک کہ اس شخص کو اس امر کے سنے جانے کا معقول موقع نہ دیا گیا ہو۔

(4) ضمن (2) کے تحت یا دیگر طور پر خالی واقع ہونے والی اسامی نئی نامزدگی سے پر کی جائے گی۔

(5) چیئرپرسن اور اراکین کو واجب الادا مشاہرے اور الاؤنس اور ان کی دیگر شرائط ملازمت ایسی ہوں گی جو مقرر کی جائیں۔

5- کمیشن کے افسران اور دیگر ملازمین۔ (1) مرکزی حکومت کمیشن کو ایسے افسران اور ملازمین مہیا کرے گی جو اس ایکٹ کے تحت کمیشن کے کارہائے منصبی کی بہتر انجام دہی کے لیے ضروری ہوں۔

(2) کمیشن کی غرض کے لیے مقرر کیے گئے افسران اور دیگر ملازمین کو واجب الادا مشاہرے اور الاؤنس اور ان کی دیگر شرائط ملازمت ایسی ہوں گی جو مقرر کی جائیں۔

6- مشاہرے اور الاؤنس گرانٹوں میں سے ادا کیے جائیں گے۔ چیئرپرسن اور اراکین کو واجب الادا مشاہرے اور الاؤنس اور انتظامی اخراجات جس میں دفعہ 5 میں محولہ افسران اور دیگر ملازمین کو واجب الادا مشاہرے الاؤنس اور پنشن شامل ہیں، دفعہ 11 کے ضمن (1) میں محولہ گرانٹوں میں سے ادا کیے جائیں گے۔

7- خالی اسامی وغیرہ سے کمیشن کی کارروائی ناجائز قرار نہیں دی جائے گی۔ کمیشن کے کسی فعل یا کارروائی پر صرف اس بنا پر اعتراض نہیں کیا جائے گا یا اسے ناجائز قرار نہیں دیا جائے گا کہ اس میں کوئی اسامی خالی ہے یا کمیشن کی تشکیل میں کوئی نقص موجود ہے۔

8- کمیشن کی کمیٹیاں (1) کمیشن ایسی کمیٹیاں مقرر کرسکتا ہے جو ایسے خصوصی امور نپٹانے کے لیے ضروری ہوں جنھیں کمیشن وقتاً فوقتاً ہاتھ میں لے۔

(2) کمیشن کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ ضمن (1) کے تحت مقررہ کسی کمیٹی کے اراکین کے طور پر ایسے اشخاص کی ایسی تعداد کو شریک کرنے، جو کمیشن کے رکن نہ ہوں، جنھیں وہ ٹھیک سمجھے، اور ایسے شریک کیے گئے اشخاص کو کمیٹی کے اجلاسوں میں شرکت کرنے اور اس کی کارروائی میں حصہ لینے کا حق حاصل ہوگا لیکن انھیں رائے دہی کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

(3) اس طرح شریک کیے گئے اشخاص کمیٹی کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے ایسے الاؤنس پانے کے حقدار ہوں گے جو مقرر کیے جائیں۔

9- کمیشن اپنے ضابطوں کو منضبط کرے گا۔ (1) کمیشن یا اس کی کسی کمیٹی کا اجلاس اس وقت ہوگا جب ضروری ہو اور ایسے وقت اور ایسی جگہ پر ہوگا جسے چیئرپرسن ٹھیک سمجھے۔

(2) کمیشن اپنے اور اپنی کمیٹیوں کے ضابطے کو منضبط کرے گا۔

(3) کمیشن کے تمام احکام اور فیصلوں کی توثیق رکن سکریٹری یا اس بارے میں رکن سکریٹری کا باضابطہ مجاز کیا گیا کمیشن کا کوئی دیگر افسر کرے گا۔

باب-3
کمیشن کے کارہائے منصبی

10- کمیشن کے کارہائے منصبی۔ (1) کمیشن مندرجہ ذیل تمام کارہائے منصبی یا ان میں سے کوئی کار منصبی انجام دے گا؛ یعنی......

(الف) آئین اور دیگر قوانین کے تحت خواتین کے لیے وضع کیے گئے تحفظات کی نسبت تمام امور کی چھان بین اور جانچ پڑتال

کرنا،

(ب) مرکزی حکومت کو ان تحفظات کے عمل پر رپورٹیں سالانہ اور ایسے دیگر اوقات پر جنہیں کمیشن مناسب سمجھے، پیش کرنا،

(ج) ایسی رپورٹوں میں یونین یا کسی ریاستی حکومت سے خواتین کے حالات کی بہتری کے لیے ان تحفظات کی موثر عمل آوری کی سفارشات کرنا،

(د) وقتاً فوقتاً خواتین کی نسبت آئین اور دیگر قوانین کی موجودہ توضیعات کا جائزہ لینا اور ان میں ترمیمات کی سفارشات کرنا تاکہ ایسے قوانین میں کسی نقائص، کمیوں یا خامیوں کو پورا کرنے کے لیے انسدادی قانون سازی کے اقدام تجویز کرنا،

(ہ) خواتین کی نسبت آئین اور دیگر قوانین کی توضیعات کی خلاف ورزی کے معاملات متعلقہ حکام کے ساتھ اٹھانا،

(و) مندرجہ ذیل امور کی نسبت شکایات کی چھان بین کرنا اور ان پر از خود توجہ دینا۔

(i) خواتین کو حقوق سے محروم رکھنا،

(ii) خواتین کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے وضع کیے گئے قوانین اور مساوات اور ترقی کے مقصد کے حصول کی عدم عمل آوری،

(iii) حکمت عملی کے ایسے فیصلوں، رہنما اصولوں یا ہدایات کی عدم تعمیل جن کا مقصد مشکلات کو کم کرنا اور بہبودی کو یقینی بنانا نیز خواتین کو امداد فراہم کرنا ہے اور ایسے امور سے پیدا ہونے والے مسائل کو متعلقہ حکام کے ساتھ اٹھانا،

(ز) خواتین کے خلاف عدم مساوات اور زیادتیوں سے پیدا ہونے والے مخصوص مسائل یا صورت حال کا خصوصی مطالعہ یا تحقیقات کروانا اور بندشوں کی نشاندہی کرنا تاکہ ان کو دور کرنے کی تدابیر کی سفارش کی جائے؛

(ح) ترقیاتی و تعلیمی تحقیق ہاتھ میں لینا تاکہ تمام امور میں خواتین کی مناسب نمائندگی کو یقینی بنانے کے طریقے تجویز کیے جاسکیں اور ان کی ترقی کو روکنے کے ذمہ دار عناصر کی نشاندہی کرنا مثلاً مکان اور بنیادی خدمات تک رسائی نہ ہونا، بے جا مشقت اور پیشہ ورانہ مضرات صحت کو کم کرنے اور ان کی پیداواری صلاحیت کو بڑھانے کے لیے ناکافی امدادی خدمات اور تکنیکی علم،

(ط) خواتین کو سماجی و اقتصادی ترقی کے منصوبہ جاتی عمل میں شرکت کرنا اور مشورہ دینا،

(ی) یونین اور کسی ریاست کے تحت خواتین کی ترقی کی پیش رفت کا اندازہ کرنا،

(ک) کسی جیل ریمانڈ ہوم، خواتین کے ادارے یا تحویل کی ایسی دیگر جگہ کا، جہاں خواتین کو بحیثیت قیدی یا دیگر طور پر رکھا جائے، معائنہ کرنا یا کروانا اور اگر ضروری پایا جائے تو متعلقہ حکام کے ساتھ انسدادی کارروائی کا معاملہ اٹھانا،

(ل) ایسی مقدمہ بازی کے لیے رقوم فراہم کرنا جس میں ایسے مسائل شامل ہوں جن سے خواتین کی ایک بڑی جماعت متاثر ہوئی ہو؛

(م) حکومت کو خواتین کی نسبت کسی امر اور خاص طور پر بعض ایسی مشکلات کی میعادی رپورٹیں دینا جن کے تحت خواتین پریشان ہوں،

(ن) کوئی ایسا دیگر امر جس کی نسبت مرکزی حکومت اس سے رجوع کرے۔

(2) مرکزی حکومت ضمن (1) کے فقرہ (ب) میں محولہ تمام رپورٹیں ایک ایسی یادداشت کے ساتھ پارلیمنٹ کے ہر ایک ایوان میں رکھوائے گی جس میں یونین کی نسبت سفارشات پر کی گئی یا مجوزہ کارروائی کی وضاحت اور ایسی سفارشات میں سے کسی سفارش کی، اگر کوئی ہو، عدم منظوری کی وجوہات درج ہوں گی۔

(3) جب ایسی کوئی رپورٹ یا اس کا کوئی حصہ کسی ایسے امر کی نسبت ہو جس سے کسی ریاستی حکومت کا تعلق ہو، تو کمیشن ایسی رپورٹ یا اس کے حصے کی نقل اس ریاستی حکومت کو بھیجے گا جو اسے ایک ایسی یادداشت کے ساتھ ریاستی قانون سازیہ میں رکھوائے گی جس میں ریاست کی نسبت سفارشات پر کی گئی یا مجوزہ کارروائی کی وضاحت اور ایسی سفارشات میں سے کسی سفارش کی، اگر کوئی ہو، عدم منظوری کی وجوہات درج ہوں گی۔

(4) کمیشن کو ضمن (1) کے فقرہ (الف) یا فقرہ (و) کے ذیلی فقرہ (1) میں محولہ کسی امر کی چھان بین کرتے وقت دعوے کی سماعت کرنے والی دیوانی عدالت کے اور خاص طور پر مندرجہ ذیل امور کی نسبت تمام اختیارات حاصل ہوں گے یعنی:۔

(''خواتین سے متعلق جنسی و دیگر جرائم'' قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

کہانی

چوڑی والا

صالحہ عابد حسین

'چوڑیاں، کانچ کی چوڑیاں، سیشے کے گلاس، بچوں کے کھلونے، گولیاں' شام کا وقت، غروب ہوتے سورج کی سرخ وسنہری کرنیں ہرے ہرے سبزے پر سونا بکھیر رہی تھیں۔ گھر والیاں، سارے دن کے کاموں سے تھک کر بیٹھی سستا رہی تھیں— گلی میں چوڑی والے کی آواز سن کر چونک پڑیں۔ بھلا کون سہاگن ہوگی جسے چوڑیوں کی چاہ نہ ہو؟ ادھر سے ادھر سے عورتوں نے جھانکنا شروع کیا اور سب سے بڑے صحن والے چودھرائن کے گھر میں بوڑھے چوڑی والے کو بلا لیا وہ خود ہی آ گیا۔ عادت جو تھی اور چار چھ ہاتھ اس کے بڑے سے ٹوکرے کو سہارا دینے کو بڑھے۔ ادھر بچوں نے دھاوا بولا، ادھر ماؤں نے للچائی نظروں سے رنگ برنگی، کامدار، شیشے کی چوڑیوں کو جو دسویں وضع کی تھیں آنکنا شروع کر دیا۔ بوڑھے نے بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا، عورتوں کو سہاگ کی دعائیں دیں— اور جو، جو جو پسند کرتا گیا اسے اس کی پسند کی چیزیں دیتا گیا..... اور جب وہ وہاں سے نکلا تو گلی کے ایک طرف کھڑکی میں ایک چہرہ چمکا۔ ایک شیریں آواز آئی— 'چوڑی والے ادھر آؤ' کمرے کے اس سرے پر ایک لڑکی کھڑی اسے اشارے سے بلا رہی تھی۔ 'چوڑی والے— اے چوڑی والے' ڈھلتی عمر کے چوڑی والے نے گردن پھیر کر دیکھا۔ ایک حسین نوجوان لڑکی، سرخ کنارے کی ساڑھی کا چھوٹا سا گھونگھٹ ماتھے تک نکالے جس میں مانگ کا سرخ سندور جھلک رہا تھا۔ ناک میں ننھی سی کیل رک رہی تھی۔ کانوں میں سونے کی بالیاں ہلکورے لے رہی تھیں جن کی دمک اس کے سنہرے رنگ کے چہرے سے ماند پڑ گئی تھی اور چہرے پر وہ دلکش مسکراہٹ تھی جو دیویوں کا حصہ ہوتی ہے۔

'چوڑی والے تمھارے پاس لال چوڑیاں ہیں؟'

'ہاں ہاں ہر رنگ کی ہیں— تمھیں کس کے لیے چاہئیں'۔

'اپنے لیے— لال لال— خوبصورت لال'۔

'بیٹی تمھاری ان صندلی کلائیوں پر تو کالی چوڑیاں بہت بھلی لگیں گی'۔ چوڑی والا تھا تو خاصا بڈھا مگر ایسی حسینہ کو دیکھ کر اس کا دل بھی مچل اٹھا۔

'نہیں بابا— ہمیں لال چوڑیاں دو'۔

'بہت شوقین ہو لال چیزوں کی' بڈھے چوڑی والے نے ہنس کر کہا— 'ذرا ہاتھ دکھاؤ—'

لڑکی ہچکچائی— 'تم چوڑیاں دے دو میں خود پہن لوں گی'۔ شرما کر لڑکی نے کہا۔

'نہیں ماں میں اپنے ہاتھ سے تمھیں چوڑیاں پہناؤں گا۔ بالکل ایسی جیسے انگوٹھی پر نگ— ان پھول جیسے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ سے چڑھاؤں گی۔ یہ میرا سو بھاگیہ ہوگا— ماں' اس بستی میں بوڑھے لڑکیوں کو بھی ماں کہتے— کبھی نہیں—

چوڑی والے کے ذہن میں، جب سے اس نے یہ کاروبار شروع کیا تھا اس وقت سے لے کر آج تک کے واقعات چکر لگا رہے تھے۔ اس نے ہزاروں گھروں میں چوڑیاں پہنائی ہوں گی۔ محلوں میں، کوٹھیوں میں، معمولی گھروں میں، جھونپڑیوں میں، کیسی کیسی حسین، مہ پارہ، دلکش

لڑکیاں، بہوویں، ادھیڑ عورتیں اور بوڑھی شوقین سہاگنیں اس کی نظر سے نہ گزری تھیں۔ مگر اس حسینہ کے چہرے پر کچھ ایسی دلکشی، کچھ ایسی شائق، کچھ ایسی مسکراہٹ اور ایسی روحانیت تھی۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک اور گھٹنوں کو چھوتے کالے بالوں میں، جنھوں نے اس کا آدھا جسم ڈھک رکھا تھا، ایسا جادو تھا کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ بس وہ اسے دیکھے جائے۔ اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اس وقت اس نے اس پیاری سی پھول سی لڑکی کو چوڑیاں نہ پہنائیں تو سب کیا کرایا سارا پیشہ، ساری عمر اکارت گئی۔ ایسے ہی ہاتھوں کی جستجو میں تو جیسے اس نے زندگی بتائی تھی، کالا سر سفید کیا تھا۔ ان ہی کی تلاش میں تو جوانی گنوائی تھی اور اس کے بوڑھے جسم میں خون گردش کرنے لگا، یہ — یہ — پیاری سی لڑکی اس کی ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے، دیوی ہے — جس کی وہ پوجا کر سکتا ہے۔ 'نہیں ماں میں خود تمھیں چوڑی پہناؤں گا۔ نہیں تو یہ کام ہی چھوڑ دوں گا — ' اس نے کچھ مسکرا کر کچھ بھرائی آواز میں کہا — لڑکی شرما گئی۔ گندمی رنگ میں سرخی کی جھلک آ گئی مگر کچھ کہا نہیں اور اپنا چھوٹا سا، موزوں، گلابی گلابی ہاتھ چوڑی والے کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بڑے پیار، بڑے ادب، بڑی محبت سے اس ہاتھ کو تھاما اور چوڑیاں چھانٹنے لگا۔ وہ بہت سی الگ ڈال دیتا۔ جیسے وہ اس کے قابل نہ ہوں۔ لڑکی کا کنول جیسا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ اس ہاتھ کو اپنے آنسوؤں سے دھو ڈالے۔ جانے کیوں اس کا دل امنڈا آ رہا تھا — جانے کیوں اسے وہ اپنی چار سالہ بچی ایک دم یاد آ گئی جو وبائی بیماری کا شکار ہو گئی تھی ایسی ہی نرم، نازک، حسین، کومل کنول اور گلاب کے میل سے بنے اس کے ننھے ننھے ہاتھ بھی تھے — وہ ان کو اپنے بوڑھے ہونٹوں سے چھونا چاہتا تھا، وہ ان پر مقدس پاک بوسوں کی بوچھار کرنا چاہتا تھا — مگر نہیں — وہ اونچے گھرانے کی ایک شریف گھر کی نوعمر بہو یا بیٹی تھی اور وہ ایک غریب نچلے طبقے کا پھٹے حال بوڑھا چوڑی والا اللہ نور — اس نے اپنے آنسو پی لیے، سر جھکا لیا اور اس کے ہاتھ کی لال لال کامدار حسین چوڑیاں اور نازک بانگوں کا جوڑ ملا کر وہ کومل ہاتھ تھام لیا اور دھیرے دھیرے خاصی تنگ چوڑیاں چڑھانی شروع کر دی۔ لڑکی کے چہرے پر ذرا سی تکلیف نظر آئی تو وہ بے چین ہو گیا 'ماں جی کیا تمھیں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔'

'نہیں تو — ' لڑکی نے چھوٹی سی سسکی لی مگر چہرے پر مسکراہٹ بھی تھی۔ مسکراتے سے اس کے گالوں پر دو ننھے ننھے گڑھے عجب بہار دے رہے تھے۔

دونوں ہاتھوں کی بھری بھری سڈول کلائیوں میں سرخ باریک کامدار چوڑیوں کے بیچ میں سادی سرخ بانگیں — آدھی کلائیوں تک بھری ہوئی ایسی حسین لگ رہی تھیں کہ آسمان کے فرشتے بھی اپنا تقدس قربان کر دیں، مگر پھر اس نے دل میں توبہ توبہ کی۔ اور ٹوکرے میں سے کانچ کے کھلونے اور طرح طرح کی پیالیاں اور جانے کیا کیا نکال کر لڑکی کے سامنے ڈال دیں۔ — 'ماں یہ تمھارے لیے ہیں — نہیں ماں — تمھارے بچے کے لیے ہیں۔'

حسینہ نے شرم سے سرخ ہو کر سر جھکا لیا۔ اس کی ساس جو ذرا دور کھڑی یہ سب تماشا دیکھ رہی تھی ہنس پڑی — 'بڑے میاں — اس کے ابھی کوئی بچہ نہیں۔ ابھی تو خیر سے بیاہ ہوا ہے۔ یہ کھلونے رکھ لو اور چند روپے اس کی طرف بڑھا دیے۔ بڈھا چوڑی والا مسکرایا۔ 'بچہ! ارے وہ خود ابھی بچہ ہے۔ پر آج نہیں تو کل بچہ بھی ہو جائے گا اور وہ خود بھی تو ان سے کھیلے گی — '

'اچھا ان کے دام تو بتا دو — '

'اماں جی چوڑی کے دام دے دو — کھلونے تو میں نے اپنی ماں کو اپنی طرف سے بھینٹ کیے ہیں۔'

' نہیں نہیں بڑے میاں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'

'ماں جی — یہ کھلونے میں بابا سے لوں گی — ' لڑکی نے متاثر ہو کر کہا — اور ہاتھ بڑھا دیا۔ بڈھے کے چہرے پر مسرت کھل اٹھی — اور وہ ٹوکرا اٹھا، سر پر رکھ، مڑ گیا — ساس پکارتی رہی۔ 'یہ کیا بچپن ہے، بہو — ارے چوڑی والے — ارے بابا — سنو تو — سنو تو — ارے چوڑی والے — مگر وہ دور جا چکا تھا — کئی گھروں سے آوازیں آ رہی تھیں مگر وہ کسی طرف نہیں مڑا — اور سڑک پر ہو لیا۔ اب دور سے آوازیں آ رہی تھیں "کانچ کی ہری لال چوڑیاں کانچ کے کھلونے — گلدان، گولیاں — کانچ کی ہری لال چوڑیاں!"

یہ چوڑی کوئی روز روز پہننے کی خریدنے کی چیز تو ہے نہیں۔ بوڑھا اللہ نور روز گلی کے سرے پر آوازیں لگاتا مگر کوئی اسے اندر نہ بلاتا۔ یہ تو تیج تہوار عید بقر عید پر سہاگنوں کے شوق کی چیز ہوتی ہے نا۔ وہ جب اس کی آواز سنتی تو ایک منٹ کے لیے کھڑکی میں کھڑی ہو جاتی۔ چوڑی والا دونوں ہاتھوں سے ٹوکرا اونچا کرتا، سر اٹھا کر اسے دیکھتا، اشارے سے دعا دیتا دونوں کی نظریں ملتیں تو نوجوان اور بڈھے چہروں پر ایک سی مسکراہٹ کھل جاتی۔ جیسے دو معصوم بچے مسکرا رہے ہوں۔ ایک دن کی ملاقات میں خلوص اور راستی کا یہ کیسا بندھن بندھ گیا تھا اس کو دونوں میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا تھا۔ حسینہ کی ساس ہنس کر کہتی 'بہو وہ تیرا سفید داڑھی والا بیٹا کیا آ گیا ہے؟'

لڑکی حجاب آمیز انداز میں مسکراتی مگر کچھ بولتی نا۔ بس کھڑکی میں سے ذرا دیر میں ہٹ آتی اور چوڑی والے کی آواز دور ہوتی جاتی۔

چوڑی والا سوچتا وہ چوڑی بیچنا چھوڑ دے۔ ترکاریاں، پھل، مٹی کا تیل یا اور ایسی چیزیں بیچے کو روز گھر میں بلایا جاسکے۔ مگر پھر وہ کنول جیسے لچک دار ہلکے گلابی حسین ہاتھوں میں چوڑیاں چڑھانے اور اس معصوم چہرے کو دیکھنے کی مسرت کا خیال کرتا۔ پھر وہ اس خوشی سے محروم نہ ہو جائے گا؟ —اس مسرت قلبی سے جو جانے کہاں سے اس کے دل میں ابل پڑی تھی، تو وہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیتا اور بھری دوپہر میں سر پر بھاری ٹوکرا اٹھائے آوازیں لگاتا پھرتا رہتا۔

اور پھر کچھ دن بعد ایسا ہوا کہ کھڑکی میں اس کی حسین 'ماں' اس کی پیاری 'بیٹی' کا چہرہ نظر آنا بند ہو گیا۔ وہ آوازیں لگاتا زور زور سے آوازیں لگاتا مگر وہ معصوم حسین چہرہ نظر نہ آتا اور مایوس ہو کر وہ آگے بڑھ جاتا مگر اسکے پاؤں بوجھل ہو جاتے۔ دل کانپنے لگتا— جانے کیسے وہ قدم بڑھا پاتا تھا۔

اور پھر کتنے ہی دن گزر گئے لیکن چوڑی والے کی آوازیں فضا میں کھوتی رہیں— وہ چہرہ— وہ چہرہ— وہ آواز دونوں کہاں کھو گئیں مولا؟

ایک دن— پھر ایک دن ہمت کر کے وہ اسی ڈیوڑھی کے سامنے جا کھڑا ہوا اور زور سے چلایا— 'ماں جی چوڑیاں چاہئیں۔'

ایک عورت کی کرخت آواز آئی 'نہیں—'

اس نے ٹھنڈی سانس بھری— پھر ہمت کی دروازے سے اندر صحن میں چلا آیا اور ڈرتے ڈرتے کرخت چہرے والی بوڑھی عورت کو دیکھا جس کے بال سفید ہو گئے تھے اور آنکھیں دھندلی 'بڑی ماں— میری ماں جی کہاں ہے—' 'یہاں نہیں ہے۔'

چوڑی والا سیکڑوں سوال کرنا چاہتا تھا مگر اس کی ہمت نہیں پڑی— وہ افسردہ، مغموم دھیمی چال سے چلتا ہوا گلی سے باہر نکل گیا اور اس امید موہوم پر کہ وہ کبھی تو گھر واپس آئے گی وہ روز اس گلی میں آتا اس کھڑکی کو دیکھتا جہاں دونوں کی نظریں ملتی تھیں مگر کھڑکی بند تھی اور گھر میں سناٹا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں، دل دھڑکنے لگتا، ٹھنڈی سانس بھر کر بڑی بڑی چال سے وہ واپس مڑ جاتا۔ مگر اگلے دن پھر آتا— امید بھی کیا چیز ہے! اور اسی طرح کئی مہینے بیت گئے۔

درگا پوجا کا تہوار آن پہنچا— چوڑیوں کی مانگ بڑھی۔ اس تہوار کے سمے پر تو سبھی عورتیں چوڑیاں ضرور پہنتی ہیں۔ بوڑھی سہاگنیں، نوجوان بہوویں، نو عمر لڑکیاں، ننھی بچیاں— امیر، غریب سبھی کو وہ پہناتا چوڑیاں مگر وہ خوشی— وہ مسرت، وہ ہاتھ— وہ کنول کی ڈنڈی جیسی کلائی وہ صندلی رنگ میں خوشی کی سرخی، وہ لال چوڑیوں میں پھنسی حسین کلائیاں کہاں ہیں؟ اسے کوئی خوشی نہ ہوتی— بس وہ اپنی 'ماں' کو یہ چوڑیاں پہنائے گا تب!! درگا پوجا پر تو وہ آئے گی جہاں بھی ہوگی— روز نت نئی حسین لال چوڑیاں لاتا اس امید پر کہ وہ پھر اسے پہنائے گا۔

انتظار سے تھک کر پھر ایک دن بوڑھا اللہ نور وہیں جا پہنچا 'چوڑیاں لو— چوڑیاں— چوڑیاں لال، لال، سبز، کامدار۔'

لیکن کسی نے کھڑکی میں سے اسے نہیں پکارا۔ کھڑکی بند تھی۔ چوڑی والا ہمت کر کے گھر میں گھس آیا۔ اور اندر سے چلایا—

'ماں جی چوڑیاں۔ چوڑیاں چاہئیں۔'

ایک ملازمہ لڑکی نے جھلا کر کہا' سو مرتبہ کہہ دیا چوڑیاں نہیں چاہئیں۔ بڑھے کی عقل ماری گئی ہے۔ سنتا ہی نہیں— سو مرتبہ کہہ دیا مگر روز آ کر پریشان کرتا ہے۔ جب ضرورت ہوگی خود بلا لیں گے—'

شرم، خوف، ذلت کے احساس سے لرزتا ہوا چوڑی والا مڑا اور دھیرے دھیرے واپس ڈیوڑھی کی طرف جانے لگا کہ یکا یک اس کی نظر اس لڑکی کی ساس پر پڑی جو کہا کرتی تھی 'بہو تیرا سفید داڑھی والا بیٹا نہیں آیا' وہ بے اختیار مڑا اور بے قرار ہو کر اس نے کہا— 'ماں جی— کیا میری ماں واپس آگئی۔'

ساس نے غمگین نظروں سے اسے دیکھا اور کانپتی آواز میں کہا' ہاں چوڑی والے وہ واپس آگئی ہے۔'

چوڑی والے کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا، آنکھوں میں مسرت کی چمک آگئی آواز خوشی سے کانپنے لگی 'ماں جی— کیا میں ایک بار اپنی ماں کو دیکھ سکتا ہوں۔ میں اتنی بار آیا ایک بار جھلک تک نہیں دیکھی۔ ایک بار بس کیا ایک بار بھی میں اسے نہیں دیکھوں گا۔ جب آتا ہوں مایوس ہو کر جاتا ہوں۔ ماں جی میں اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔'

ساس کچھ دیر بت بنی کھڑی رہی۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں، لب کانپ رہے تھے چہرہ زرد تھا۔

'نہیں بڑے میاں۔'

بڑھے کا خوشی سے دمکتا چہرہ ماند پڑ گیا جیسے جلتا چراغ بجھ جائے۔ اس نے پُر آب آنکھوں سے بوڑھی کو دیکھا— اپنے لڑکھڑاتے قدموں کو سنبھالا اور جانے کو مڑا۔ پوجا کے تہوار کے لیے اس نے سارا بازار چھان کر اس کے لیے بہترین سرخ چوڑیوں کا جوڑا خریدا تھا۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے اسے پہنائے گا۔ وہ اگر اس کی اپنی بیٹی ہوتی— کیا اسی طرح یہ بڑھیا

اس کا اور بڈھے کا دل توڑ کر انکار کر دیتی۔ غصے کی ایک لہر اس کے جسم بھر کو لرزا گئی۔ اس نے اپنی میلی آستین سے آنسو پونچھے اور باہر کی طرف جانے لگا۔ ساس اب تک برامدے میں کھڑی تھی۔ اس نے مڑ کر کانپتے ہوئے لہجے میں کہا 'ماں جی میں اب کبھی چوڑی بیچنے نہیں آؤں گا مگر ایک بار میری' ماں' کو دکھا دو اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

جو بھی رکاوٹ بہو کو یہاں لانے میں تھی وہ ان آنسوؤں کی بوچھار نے دور کر دی۔ اس نے بڈھے کو دیکھا، آسمان کو دیکھا، زمین کو دیکھا اور کانپتی آواز میں چلائی۔۔ 'چھوکری — لڑکی کو — بہو کو — یہاں لے آ۔"

چند لمحے بعد دھیرے دھیرے پہلے لڑکی کے پیر، پھر جسم اور پھر سارا سراپا اندر سے باہر آتا نظر آیا — اور وہ آ کر بڈھے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ مگر چوڑی والے کو اس کا ہوش کہاں تھا وہ تو اس نایاب حسین چوڑیوں کے جوڑے کو تلاش کر رہا تھا جو وہ اس کے لیے لایا تھا۔ اور پھر اس نے ہاتھ بڑھایا' ماں — میں تمہارے لیے دیکھو کیسا خوبصورت لال جوڑا لایا ہوں'۔ یہ کہتے کہتے چوڑی والے نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا۔ اور پتھر کا بت بنا کھڑا رہ گیا۔ نو عمر حسینہ، گھر کی بہو، اللہ نور کی ماں، چوڑی والے کی بھتیجی بیٹی — سامنے کھڑی تھی۔ مگر — مگر اس کے جسم پر کوئی زیور نہ تھا، لال کناری کی ساڑھی نہ تھی، نہ مانگ میں سندور، نہ پیروں میں مہاور، نہ ہاتھ میں چوڑی — نہ لبوں پر لاکھا اور نہ وہ دنیا بھر کو مسحور کرنے والی پیاری مسکان!

سفید دھوتی جسم پر لپیٹے رنج و غم کی مجسم مورتی جو ایک طرف کو جھکی تھی، اس کے سامنے کھڑی تھی!! اس دیش کی ایک کم سن بیوہ!!

چوڑی والے نے چوڑی کا جوڑا اپنے ہاتھ سے زمین پر پھینک دیا اور چوڑے کے ٹوٹے ٹکڑوں کی سی روتی آواز — ہچکیوں سے لرزتی آواز بلند ہوئی۔

'ہائے — ہائے میری ماں جی — یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ ہائے اللہ میں یہ سب دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہ گیا — کیوں نہ مر گیا مولا —'

نوجوان لڑکی نے اپنا سر اور جھکا لیا اس کی آنکھوں سے جو آنسو موتیوں کی لڑیوں کی طرح ٹپک رہے تھے اس نے اس کی سفید دھوتی اور کنول جیسے ہاتھوں کو تر بتر کر دیا تھا۔

پھر وہ آہستہ — اور آہستہ — بہت آہستہ مڑی اور اندر کی طرف چلی۔ پیچھے پیچھے اس کی ساس بھی چلی گئی۔

کانپتے ہاتھوں سے بڈھے نے ٹوکرا سر پر اٹھایا، اور دل شکستہ غریب، غم نصیب، چوڑی والا گھر سے نکل گیا۔

اس سے نہ اپنا بوجھ اٹھ رہا تھا نہ ٹوکرے کا نہ آواز نکل رہی تھی —

اس نے اپنا سر ٹوکرے پر جھکا دیا —

اس کا سارا جسم ہچکیوں سے لرز رہا تھا۔

(ٹیگور کی کہانی سے ماخوذ)

فرہنگ آصفیہ سے

امام ضامن۔ ع۔ اسم مذکر۔ یہ حضرت سیدنا علی رضا ابن موسی الکاظم کا جو آٹھویں امام ہیں عرف ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے آپ کو امام ثامن بھی کہتے ہیں آپ ایک سو اڑتالیس ہجری میں بمقام مدینہ منورہ پیدا ہوئے۔ آپ کی کنیت ابوالحسن ہے اور القاب رضا۔ صابر۔ زکی۔ دولی ہے آپ خلفائے عباسی میں سے خلیفہ مامون بن ہارون رشید کے زمانہ میں موجود تھے۔ خلیفہ مذکور نے اپنی ایک خاص منت پوری ہو جانے کے سبب اپنا خلیفہ قرار دیکر اپنی بیٹی مسماتہ ام حبیب سے ۲۰۲ھ میں نکاح کر دیا تھا۔ کیونکہ اسی زمانہ میں خلیفہ وقت نے کربلائے معلی جانے کی سخت پابندیاں بمنزل ممانعت کر دی تھیں پس آپ وہاں جانے والوں کے کفیل و ضامن ہو جایا کرتے تھے۔ تاکہ زائرین ثواب زیارت سے محروم نہ رہیں پس اس وجہ سے آپ کو امام ضامن کہنے لگے۔ تاریخ الائمہ ایک امامیہ مذہب کی کتاب میں درج ہے کہ آپ جس طرح خلق اللہ کی بخشش کے ضامن ہیں اسی طرح حیوانات کے بھی بعض اوقات صیادوں سے ضامن ہو گئے ہیں۔ چنانچہ کتاب مذکورہ میں آہو و صیاد وغیرہ کا قصہ لکھ کر اس امر کی تصدیق کی ہے۔ لہذا بوجوہ بالا مستورات اہل اسلام کا یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ جب کوئی سفر کو سدھارے یا کہیں بیاہ خواہ منگنی ٹھیرائی جائے اور امام صاحب کے نام کا روپیہ پیسہ خواہ اشرفی یا کوئی سکہ بازو پر باندھا جائے تو آپ مراد پر پہنچانے کے ضامن ہو جاتے ہیں۔ جس وقت مسافر منزل مقصود پر پہنچتا یا وہ کام ہو جاتا ہے تو اس رقم کو سیدوں پر تقسیم کر دیتے ہیں۔ غرض آپ ۵۵ برس زندہ رہے اور آخر صفر ۲۰۳ھ میں زہر آلودہ انگوروں کے ازجانب خلیفہ کھلائے جانے سے رحلت فرمائے عالم قدس ہوئے۔ اس موت کی آپ نے پہلے سے پیشین گوئی کر دی تھی۔ آپ کا مزار پر انوار شہر طوس واقع خراسان متصل قبر ہارون رشید ہے۔

کہانی

آمنہ ابوالحسن

اگر

گلی میں کھیلتا ہوا ننھا شمیم زمین پر بکھرے ہوئے کچے سمیٹ کر پکا اور ٹوٹے ہوئے برآمدے میں پہنچا، بولا — 'وہ لوگ آرہے ہیں ابا —'

کام سے سر اٹھا کر رحیم نے پوچھا — 'کون لوگ بیٹے؟'

'وہی جو چند دن پہلے بھی آئے تھے آپ کے پاس۔'

اتنے میں وہ آگئے۔

'نمسکار — ست سری اکال رحیم بھائی —'

'آداب — آداب — آیئے آیئے —' رحیم نے مرمت کرنا چھوڑ کر سائیکل دیوار سے ٹکائی اور سب برآمدے کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔

شمیم جو کچے مٹھی میں دبائے ایک طرف کھڑا تھا جھٹ بولا — 'اب میں کھیلنے جاؤں ابا —؟'

'جاؤ —' رحیم نے اس کی طرف بغیر دیکھے کہا —

'چلو پاس کے ڈھابے پر چائے پیتے ہیں۔'

'مگر کیا اتنے پیسے ہیں تمھارے پاس رحیم بھائی —؟'

'پروردگار کی مہربانی ہے — اس وقت نہ بھی ہوئے تو نہ سہی جب آجائیں گے ادائیگی ہو ہی جاتی ہے — ڈھابے والا پڑوسی جو ہے —'

'ہاہاہا —' سریش نے ایک اڑتا ہوا قہقہہ لگایا —

'یہ بھی کوئی پہچان ہوئی یار — ڈھابے والے کی؟ زندگی میں کاروبار میں صرف اچھے ملاقاتی گنے جاتے ہیں یار رحیم — تم یہ بات سوچتے کیوں نہیں —'

'سوچنے سے کیا فائدہ جی۔ اچھے ملاقاتی لاؤں کہاں سے — غریب ہوں۔ غریبوں سے ہی ملاقات رہے گی میری۔ امیروں کیبروں سے تھوڑی —'

'انسان کوشش کرے تو سب ممکن ہے بھائی۔ ہماری تو تم مانتے نہیں ورنہ منٹوں میں امیر بن جاتے۔ خود دیکھ لیتے کیسے کیسے لوگ تمھارے آس پاس ہوتے —'

'تمھارا کہا درست سہی سریش بھائی — کام بے شک مناسب ہے لیکن میں گھر سے دور چلا گیا تو میرے ضعیف باپ، پردہ نشیں بیوی اور کم عمر لڑکے کو کون دیکھے گا۔ تینوں توجہ کے محتاج ہیں اس وقت۔ تمھارا کہنا ہے چھٹی جلد جلد نہیں ملے گی اس نوکری میں — مہینے کے آخر میں صرف ایک بار —؟'

'تو پھر — سرکاری نوکری تھوڑی ہے جو باقاعدہ چھٹی ملا کرے۔ پرائیوٹ نوکری ہے یار اور پرائیوٹ نوکری میں تو سب کچھ مالک کی مرضی سے ہی چلتا ہے۔'

'اسی لیے تو نامنظور ہے مجھے سریش بھائی۔ قناعت ہونا۔ دن بھر کی محنت کے بعد روکھا سوکھا جو بھی ملتا ہے سب کے حلق تھوڑے بہت گیلے ہو جاتے ہیں —'

'لیکن رحیم بھائی ہماری لائی ہوئی نوکری میں تو نہ صرف سوکھے حلق گیلے ہوں گے بلکہ پیٹ بھر روٹی کا سکون بھی ملے گا۔ تم گھر سے دور رہو گے یہ ٹھیک ہے البتہ —'

اسی وقت رحیم کے بڈھے بابا فہیم باہر سے آتے ہوئے قریب سے گزرے تو سریش اور جیتندر سنگھ بولے — 'نمسکار باباجی — ست سری اکال باباجی —'

'جیتے رہو — جیتے رہو —' بڈھے بابا اپنی ٹوٹی کوٹھری میں چلے گئے۔

’دور رہنے سے میں ڈرتا نہیں سر تیش بھائی لیکن فکر صرف گھر والوں کی ہے—‘

’سوچ لو بھئے— ابھی تھوڑا وقت ہے ہمارے پاس۔ مان لو تو تمھیں نوکری ملے گی ہمیں انعام ورنہ تم جانو پھر— ہم تو یہ سوچ کر گھبراتے ہیں کہ جی کس طرح لیتے ہو ایسے— سائیکلوں کی مرمت سے ملتا ہی کتنا ہے—‘

’جیسے تیسے گزر رہی ہے— اللہ کی مرضی‘ یہ سن کر سر تیش اور سنگھ کے چہرے تمتما گئے۔ الو کا پٹھا— احمق—!! انھوں نے سوچا، اب اللہ نے یہ تو نہیں کہا ہوگا کہ اچھی نوکری ملے تب بھی اسی پھٹیچر دکان سے چپٹے رہنا۔ تف ہے کمبخت کی سمجھ پر— بڈھا باپ، چھوٹا بچہ اور پردہ دار بیوی جس نے کبھی کوٹھری سے قدم باہر نہیں نکالا— اونہہ— مرے سالا— ہمیں کیا— دونوں اٹھ کھڑے ہوئے—

’اچھا یار— سوچ لینا۔ دو چار روز بعد ہم پھر آئیں گے—‘

منڈیر سے اٹھ کر رحیم دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہوا تو کوٹھری سے سر نکال کر فہیم بابا نے دریافت کیا— ’یہ گھر سے دور جانے کی کیا بات ہو رہی تھی بیٹا— ؟‘

رحیم نے دیکھا اس کے بڈھے باپ کے چہرے کی ہر سلوٹ میں بے شمار الجھنیں پھنسی ہوئی تھیں اور اترتی دھوپ میں سلوٹوں کے اس جال نے بڈھے بابا کے تمام چہرے کو ڈھک رکھا تھا۔ وہ ملائمت سے بولا— ’ایک ملازمت کی بات تھی ابا— رد کر دی میں نے کیوں کہ آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا—‘

فہیم بابا نے تشکر سے اسے دیکھا اور اپنے شبہات کو اندر ہی اندر دبوچ کر کھنکھارے—

’میں نے گھر چھوڑ کر اچھی ملازمت کی تو تمھارا یہ حال ہوا رحیم۔ میری غیر موجودگی میں نہ تم اسکول گئے نہ پڑھائی کی ورنہ آج کلرک تو بن ہی جاتے۔ اب پرائیوٹ نوکری پر تم گھر چھوڑ کر جاؤ گے تو شمیم کا بھی حال ہوگا بیٹا— اسے کلرک بنتا دیکھے بغیر میری روح ہرگز ہرگز جسم نہ چھوڑ سکے گی۔‘

’بنے گا ابا— شمیم ضرور کلرک بنے گا۔ آپ اداس فکر مند نہ ہوں۔ سنا ہے آج کل سرکار غریبوں کو پڑھائی کی کافی سہولتیں دے رہی ہے ورنہ ہمارے پاس کہاں اتنا پیسہ ہے بھلا کہ شمیم پڑھ سکے۔ آپ کی خواہش پوری کرنے کے لیے سرکاری سہولت کا ہی فائدہ اٹھاؤں گا انشاء اللہ—‘

شمیم ضرور اسکول جائے گا۔ یہ بات ایک مضبوط لاٹھی بن کر فہیم بابا کے بڈھے ضعیف ہاتھوں میں تھم گئی۔ اس خیال کے تحت فہیم بابا کو لگا جیسے لمبی لمبی ہری ہری بیلیں ان کی جگہ جگہ سے ٹوٹی پھوٹی شکستہ کوٹھری سے لپٹ گئی ہیں اور ان کی تازگی اور لہلہاہٹ بیچاری سوکھی پیاسی تنگ داماں کوٹھری میں سراسر کر خوشگوار مہک پیدا کر رہی ہے اور ہوا انھیں جھلا جھلا کر سائبان کی طرح کوٹھری کی بے بضاعت بوسیدہ چھت پر پھیلا رہی ہے—

فہیم بابا نے کبھی خواب نہیں دیکھے تھے۔ انھیں خواب دیکھنے والوں سے چڑ تھی۔ کام ان کی زندگی کا مسلک تھا۔ صرف دو حرف بھی وہ پڑھ نہیں پائے تھے مگر ایمانداری ان کی روح تھی۔ خود کام کرتے ہوئے اور دوسروں کو کام میں مصروف دیکھ کر ڈھیروں توانائی ان میں پیدا ہو جاتی تھی اسی لیے بہتر سے بہتر طریقے پر وہ ہمیشہ اپنی ڈیوٹی بجالاتے تھے۔۔ اپنے گھر سے دور ایک بڑے افسر کے گھر کی دیکھ بھال کرتے تھے تاکہ گھر کے گزارے اور رحیم کی تعلیم کے لیے پیسے کی تنگی نہ ہو۔ رحیم پڑھے لکھے، کچھ بنے مگر باپ کی غیر موجودگی، باپ کے ڈر سے آزاد اور بے فکر ہو کر رحیم نے اپنی ماں اور دادی کی کبھی نہیں مانی۔ گلی محلے کے بیکار بے پروا بچوں کے ساتھ ہر وقت بلّا بازی میں مصروف رہا— چھٹی میں گھر آ کر جب جب فہیم بابا نے اسے پیٹا اس نے آئندہ پڑھائی کا وعدہ کیا لیکن پٹنے سے پڑھائی کا شوق ہونے کی بجائے پڑھائی سے نفرت ہی ہو گئی۔ لہٰذا تمام دھنوں کے باوجود رحیم نے کبھی پڑھائی نہ کی— تھک کر۔ ریٹائر ہو کر فہیم بابا نے اپنی جمع پونجی سے اسے سائیکلوں کی مرمت کی ایک چھوٹی سی دکان کھول دی اسی میں وہ اب تک ٹھنسا ہوا تھا— فہیم بابا چاہتے تو ریٹائرمنٹ کے بعد رحیم ان کی جگہ لے سکتا تھا مگر فہیم بابا نہیں چاہتے تھے کہ رحیم کی طرح شمیم بھی محتاجی کی زندگی گزارے۔ برائے نام روزگار کی اس دکان پر بیٹھے بیٹھے رحیم شمیم پر نگاہ تو رکھ سکے گا۔ خود کچھ نہ بن سکا لیکن شمیم کو ضرور کچھ بنا سکے گا۔ یہی فہیم بابا نے دور اندیشی کی—

علم نے ان کے ذہن کو اجالے نہیں بخشے تھے مگر تجربوں نے ان کی فکر پر جلا ضرور کر دی تھی۔ اچھے گھرانے کی ملازمت نے زندگی کو سنوارنے کے طریقے انھیں سمجھا دیے تھے۔ اب جب کہ وہ ریٹائر ہو چکے تھے کام کرنے کی ان کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ رحیم کو کام میں مشغول دیکھ کر اپنی ضعیفی بھول جاتے— زیر لب مسکراتے رہتے اور گاہکوں کے علاوہ جو کوئی رحیم سے ملنے آتا اس پر نظر رکھتے، وہ جانتے تھے غریبی اس ٹھیکرے کی طرح ہوتی ہے جسے ہر کوئی ٹھوکر مار سکتا ہے۔ کوئی بھی ٹھوکر رشتوں کو اکھاڑ سکتی ہے۔۔ توڑ سکتی ہے۔ کہیں بھی پہنچا سکتی ہے اور جو چیز، ایک بار اکھڑ

جائے وہ ضرور ختم ہو جاتی ہے پھر پنپ نہیں سکتی اسی لیے اہم بات یہی ہے کہ اپنی جگہ نہ چھوڑی جائے۔ وہ کتنی چھوٹی کیوں نہ ہو، اس پر اپنا قبضہ ضروری۔ دنیا بڑی تیزی سے بدل گئی تھی۔ اب تو قانون کے ساتھ ساتھ لاقانونیت بھی حکمراں تھی اسی خوف اسی خدشے کے تحت فہیم بابا ہر وقت رحیم کے ارد گرد منڈلایا کرتا اور خدا کا شکر بجالاتا کہ رحیم لالچی نہیں۔

ننھا شمیم صبح دوپہر شام 'کچے' کھیلتا ہوتا اور دادا سے شکوہ کرتا 'ہم غریب کیوں ہیں دادا۔ مارے پاس اچھا کھانا۔ اچھے کپڑے کیوں نہیں' شمیم منہ لٹکاتا ــــ ''اللہ کی مرضی بیٹے ــــ دوسروں کو دیکھنے کی بجائے خدا جو ہمیں دے اسی میں خوش رہنا چاہیے بچے ــــ'

وہ آہستہ آہستہ اپنی باتوں اپنے ارادوں سے پہلے تو خدا تعالیٰ کو شمیم کے وجود میں بھرتے رہتے پھر اس کے دل میں محلے ٹولے کی سرگرمیوں کو دبا کر مدرسے کو ابھارتے۔ کتابوں کو سنوارتے رہتے۔ اسی کوشش کے نتیجے میں جس روز شمیم نے محلے کے چھوٹے سے مدرسے میں اپنے قدم رکھے فہیم بابا نے ترک ملازمت کے وقت اتارے ہوئے اپنے عمامے کو شان سے دوبارہ اپنے سر پر جمالیا اور اسکول سے شمیم کے لوٹنے تک سارا وقت بازار کی مختلف دکانوں پر بیٹھے اتراتے رہتے۔ اپنے پوتے شمیم کے اسکول جانے کی بات کوئی سنے نہ سنے سب کو سناتے رہتے۔ اسی طرح جس روز شمیم نے دسویں جماعت پاس کرلی فہیم بابا مسکراتے مسکراتے اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ ان کا نصب العین پورا ہو چکا ــــ

فہیم بابا خوشی خوشی مر گئے تو رحیم نے ان کا عمامہ اپنے سر پر تو نہیں لپیٹا لیکن احتیاط سے رکھ ضرور لیا۔ وہ ایک معمولی میکانک، اس پر عمامہ سجتا بھلا؟ وہ اپنے غریب والد کے چھوٹے سے وقار کی توہین نہیں برداشت کر سکتا تھا۔ اس کے ناتراشیدہ غیر تربیت یافتہ ذہن میں عمامے کا بڑا بلند بڑا خاص مقام تھا۔ وہ اس عمامے کو شمیم کے سر پر بھی نہیں سجا سکتا تھا کیونکہ اگرچہ ترقی کی دوڑ میں شمیم حسب حیثیت کافی بڑھ چکا تھا اور ایک اہم دفتر کے اعلیٰ افسر کا خصوصی چپراسی بنا ہوا تھا پھر بھی عمامہ پہننے کے لائق تھوڑی تھا۔ اب بالکل فہیم بابا کی طرح رحیم بھی شمیم کی تمام حرکات پر کڑی نظر رکھتا۔ وہ کب کہاں جاتا کس کس سے ملتا جلتا۔ کب گھر لوٹتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام معلومات شمیم کے دفتر کا دوسرا چپراسی جو اتفاق سے ان کا ہم محلہ تھا۔ رحیم کو روز پہنچایا کرتا۔ ایک طرح سے رحیم نے اس لڑکے کو اس کام پر مامور ہی کر رکھا تھا جس کے عوض اس کی سائیکل کا پنکچر وغیرہ وقتِ ضرورت مفت جوڑ دیا کرتا تھا۔

زندگی اطمینان سے گزر رہی تھی کہ ادھر چند روز سے ایک انجانا گروہ ملازمت کے بعد تھکے ہارے شمیم کے پاس آتا اور اسے یاد دلاتا ــــ

'تمھارے دادا گزر گئے نا ــــ؟'

'جی ہاں ــــ'

'تمھارے ابا کی آمدنی بہت مختصر ہے نا ــــ؟'

'ہاں ــــ'

'آج کل کی بڑھتی ہوئی مہنگائی کو دیکھتے ہوئے خود تمھاری تنخواہ ناکافی ہے نا ــــ؟'

'شاید......'

'تمھاری والدہ بوڑھی اور بیمار ہیں نا ــــ؟'

'ہاں ہاں ــــ'

'تمھاری یہ بوسیدہ کوٹھری ناقابل رہائش اور خطرناک ہے نا ــــ؟'

'تو ــــ؟'

'تو تم کچھ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ان مشکلات پر قابو پا کر آرام سے جی سکو ــــ؟'

'آرام ہم غریبوں کی قسمت میں کہاں بھائی صاحبو ــــ زمانے سے لڑنے کا حوصلہ ہے نہ قابلیت ہے ہمارے پاس ــــ ہر ایک کی اہلیت کے مطابق ایسے پلان جو غریبوں دلدلوں سے نکال کر زرخیز زمینوں تک پہنچا دیں۔ جو جنگی جھونپڑیوں سے پکی کوٹھریوں تک لے جا سکتے ہیں کام کرنے والوں کو ــــ

'کیا سچ مچ ــــ؟' تعجب سے شمیم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ــــ 'کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟'

'کیوں نہیں بھائی صاحب۔ آزما کر دیکھ لو خود ــــ زیادہ کیوں کہیں ہم ــــ'

اور شمیم نے فوری فیصلہ کیا وہ ضرور ان منصوبوں کو آزمائے گا۔ ان لوگوں نے شمیم کو اپنے دفتر کے ایڈریس کا کارڈ دیا اور اگلے روز آنے کا وعدہ لے کر روانہ ہوئے ــــ

اگلی صبح تیار ہو کر شمیم جانے لگا تو ایک نظر اسے دیکھ کر رحیم نے سوچا پوچھ لے کہاں کے ارادے ہیں پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ خاموش ہو رہا مگر گلی کے نکڑ پر بیٹھے فقیر دادا اس کی سج دھج دیکھ کر خاموش نہ رہ سکے۔

'کہاں کے ارادے ہیں بھوا آج دفتر جاتے تو نہیں لگتے تم ــــ'

'سچ پہچانا فقیر ا دادا آپ نے ــــ میں آج دفتر نہیں جا رہا ہوں بلکہ ایک نئے کام کو طے کرنے جا رہا ہوں۔ دیکھیے یہ رہا اس دفتر کے پتے کا

کارڈ— 'شمیم نے دفتر کا اتا پتا اپنے ذہن میں جما کر رعب سے کارڈ فقیرا دادا کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔' ان لوگوں نے اس وعدے سے بلایا ہے دادا کہ ہم غریبوں کو اب غریب نہ رہنے دیں گے۔ ترقی کرا کے مطمئن انسان بنا دیں گے۔ ذرا دیکھوں تو ترقی کے ان کے پلان— 'مسکرا کر شمیم چل پڑا—

ترقی کے پلان—؟ فقیرا بدبدایا— جانے کیسے ہوتے ہیں۔ کیسے غریب کو سکھی کر سکتے ہیں۔ لمحہ بھر کے لیے اس تصور سے اس کی ماند ماند آنکھیں خیرہ ہوئیں پھر ہاتھ میں تھما کارڈ لے کر وہ فوراً رحیم کے پاس پہنچا اور بے صبری سے بولا—

'اب دیکھنا کہ ہماری یہ چھوٹی اندھیری غلیظ کوٹھریاں کیسی صاف ستھری اور پکی بن جائیں گی۔'

'کیا—؟' کچھ نہ سمجھ کر رحیم نے پوچھا—

'ہاں ہاں یہی کہتے ہیں وہ لوگ—'

'کون لوگ—؟'

'یہ کارڈ دینے والے جنھوں نے بڑا شمیم کو اپنے دفتر بلوایا ہے آج۔ ترقی کے پلان بتلانے کو—'

یہ سنتے ہی مرمت کا کام چھوڑ کر کارڈ ہاتھ میں لیے رحیم سرپٹ بھاگا— جانے کون لوگ ہیں—؟ کیا کروانا چاہتے ہیں شمیم سے—؟ کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تو پھر شمیم کی چپراسی کی سرکاری نوکری کا کیا بنے گا بھلا—؟

لپکا لپکا— ٹھہر ٹھہر کے راستے کے لوگوں سے کارڈ پر لکھا اتا پتا پوچھتا بالآخر وہ اس دفتر پہنچ ہی گیا۔ چوڑے احاطے کا آہنی سلاخوں والا بڑا پھاٹک بند تھا جس کے ساتھ کرسی بچھائے بندوق ہاتھ میں تھامے گل مچھوں والا سنتری بیٹھا باہری راستے کو گھور رہا تھا۔ مارے ڈر کے رحیم کو تھرتھری چھوٹ گئی۔ یہ سنتری اسے اندر تھوڑی جانے دے گا بھلا— چپکے سے وہ دفتر کی عمارت کی پچھلی جانب کھسک لیا—

شمیم کتنا بھی سمجھدار سہی مگر اس عمر کے لڑکوں کی سمجھداری اس خنجر کی طرح ہوتی ہے جو کبھی کبھی خود مارنے والے کو بھی چبھ کر زخمی کر سکتا ہے۔ پوری خاموشی سے عقبی دیوار سے سٹ کر رحیم نے سلاخوں والی کھلی کھڑکی سے اندر جھانکا— ایک لمبا کمرہ نوجوانوں سے بھرا تھا۔ کرسی پر بیٹھا افسر انھیں بتلا رہا تھا۔' پیسے کی ہمارے پاس کمی نہیں۔ ہم کام کرنے والوں کے دامن پیسے سے بھر دیں گے مگر کام آپ کو وہی کرنا ہوگا جو ہم چاہیں گے؟ جس طریقے سے جب ہم چاہیں گے۔ کام کے لیے رات دن کی کوئی تخصیص نہیں ہوگی۔'

'ٹھیک ہے ٹھیک ہے ہم تیار ہیں۔' کئی بے حد غریب نوجوانوں نے اثبات میں سر ہلائے۔ ان سب سے فوراً کاغذوں پر انگوٹھے لگوا لیے گئے— لیکن کچھ نوجوانوں نے کام کی وضاحت چاہی—

'آپ سب کو نزدیکی اور دور دراز دونوں جگہوں پر ہمارا دیا ہوا مال سپلائی کرنا ہوگا جو بھی چیز دی جائے اسے مکمل حفاظت سے پہنچانا ہوگا۔ ہمارے کارخانوں میں ضرورت کے مطابق کام کرنا ہوگا اور سخت ضرورت پڑنے پر اپنا نام بھی بدلنا ہوگا۔'

'کیا—؟' رحیم کے دیکھتے دیکھتے شمیم اسپرنگ کی طرح اچھلا—

'ہم نام نہیں بدلیں گے۔ نام ہماری پہچان ہے صاحب—'

'تو پھر تمھیں کام بھی نہیں ملے گا—'

'نہ ملے—'

'ارے نام بدلنے سے ہم خود تو نہیں بدل جائیں گے۔ یہ تو بس کام بھر کی مجبوری ہوگی جیسے ہی کام ختم ہوگا ہمارے نام ہمیں مل جائیں گے۔ ہے نا صاحب—؟'

مگر کرسی پر بیٹھے افسر نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا—

'احمقو— 'شمیم ایک دم دھاڑا—

'مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آ رہا ہے یہاں— چلو یہاں سے، نہیں چاہیے ہمیں نام کے عوض کام—'

شمیم نے وہ فارم جن پر کام کے خواہش مند لوگوں نے انگوٹھے لگائے تھے افسر کے سامنے سے جھپٹ لینے کی کوشش کی—

'پکڑو پکڑو— مارو اسے— یہ سرپھرا خواہ مخواہ سب کو بہکا رہا ہے۔ خود چپراسی ہے تو سمجھ رہا ہے دوسرے بھی کام سے لگے ہوئے ہیں— خبردار جانے مت دینا اسے—'

'بند کرو بیکار بکواس— 'بڑے افسر کا نائب جو لوگوں کے ساتھ کھڑا تھا بولا— 'معمولی چپراسی ہو کر صاحبوں جیسے تیور مت دکھلاؤ۔ پہلے افسر بنو پھر ایسی بات کرنا—'

'بے شک میں ایک معمولی چپراسی ہوں جی! مگر کیا چپراسی انسان نہیں ہوتے جناب؟'

'جناب کے بچے' بے روزگار غمزدہ افلاس کے ستائے ہوئے دکھی لوگوں نے شمیم پر یلغار کی۔

'تم کون ہوتے ہو مجھے مجبور کرنے والے— نہیں کرنا چاہتے کام تو دفع ہو جاؤ یہاں سے— آخر نام نے کیا دیا ہے ہمیں۔ اگر نام بدلنے سے آرام کی چند سانسیں میسر آ سکتی ہیں تو کیوں نہ بدلیں نام—

ضرور بدلیں گے تم نہیں روک سکتے ہمیں—'

کسی نے شمیم کا کالر کھینچا۔ کسی نے آستین۔ کوئی اس کے بال کھسوٹنے لگا کوئی اس کی پیٹھ پر دو ہتھڑ مارنے لگا— 'دفع ہو—دفع ہو— تم کوئی خدائی فوجدار نہیں ہو—'

مارے طیش کے شمیم نے خود پر جھپٹتے ہوئے جانوروں جیسے لوگوں کو پوری طاقت سے مخالف سمتوں میں دھکیلا اور بڑے افسر کی جارحانہ دھمکیوں سے بے پروا کمرے سے کود کر صحن میں اترا اور لپکتا ہوا بند پھاٹک کی طرف جانے کی بجائے قریبی پیڑ کے سہارے اوپر چڑھ کر احاطے کی دیوار پھلانگ گیا—اسے کمرے سے نکلتا دیکھ کر رحیم کھڑکی چھوڑ کر بھاگا۔ آہنی تار لگے حفاظتی حصے میں گھسنے کی کوشش میں اس کی پھٹی ہوئی قمیض اور کندھوں کی خراشوں سے خون رس رہا تھا مگر یہ خوشی کہ پیسے کی چمک دمک سے شمیم نے خود کو مسخ نہیں کیا۔ اپنے باپ دادا کو ذلیل نہیں کیا، قوت کا زبردست خزانہ بن گئی اس میں۔ وہ بے تحاشہ بھاگا اور دوڑتا ہوا شمیم تک پہنچا۔ پھر قبل اس کے کہ بند پھاٹک کھول کر بے رحم سنتری ان تک پہنچتا یا مشتعل لوگ اندر سے نکل کر انھیں جھپٹ لیتے رحیم نے سہارا دے کر شمیم کو اٹھایا اور پورا زور لگا کر دوڑتے ہوئے دونوں پاس والی گلی میں گھس کر پیچ در پیچ سنسان راستوں سے ہوتے ہوئے آخرکار اپنی اندھیری سیلی ہوئی کوٹھری میں داخل ہو کر اپنی بیوی کی حیران پریشان نظروں سے بے نیاز رحیم نے چھت سے بندھے ہوئے ایک کپڑے میں احتیاط سے لپٹا ہوا عمامہ نکالا اور بلا تاخیر شمیم کے سر پر رکھ دیا—

'یہ لے اپنے دادا کا عمامہ۔ اب تو حقدار ہے اس کا— غریبی دلدل ضرور ہے مگر ایمان وہ روشنی ہے جو ہر اندھیرے کو آسان کر دے۔ اللہ پاک تیرے اندر بسا ہوا ہے یہ اطمینان ہی میری زندگی کا حاصل ہے۔ اب میں مر بھی جاؤں تو کوئی پروا نہیں—'

یہ سن کر خوشی کے آنسو پونچھ کر شمیم نے سوچا— اگر وہ دادا فہیم کو بھول جاتا تو شاید اپنے مفاد کے لیے خدا کو بھی بھول سکتا تھا مگر دادا فہیم تو 'کچے' کھیلتے وقت ہی اس کے بچپن کو بڑا پن عطا کر چکا تھا۔

فرہنگ آصفیہ سے

آبِ زمزم۔ ف + ع۔ اسم مذکر (آب + زمزم) مادۂ (زم) (۱) کھاری پانی۔ ململا پانی۔ (از مدُّ القاموس) (۲) کعبہ کے کنویں کا پانی۔ اگرچہ یہ پانی ململا ہے مگر اس کا پینا نجات کا وسیلہ تصور کیا جاتا ہے۔

گیا جو اس کے کوچے میں وہ با چشم پُر آب آیا
حرم سے لاتے ہیں جس طرح زائر آبِ زمزم کا (ناسخ)

ترے عاشق کو یوں ہے خوشگوار آبِ دمِ خنجر
مسلماں کو لگے جس طرح شیریں آبِ زمزم کا (ذوق)

کہتے ہیں کہ جب بیوی ہاجرہ کے پیٹ میں حضرت اسماعیل پڑے تو حضرت ابراہیم ﷺ اپنی پہلی بیوی سارہ کو رشک نہ ہونے کے خیال سے انہیں مکے کے میدان میں چھوڑ گئے۔ یہاں آ کر حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو اس وقت ان کی والدہ کو نہایت تشنگی ہوئی اور پانی کے واسطے ادھر ادھر بلبلاتی پھریں۔ خدا کی شان، جس زمین پر حضرت اسمعیل پڑے ہوئے ٹانگیں مار رہے تھے ان کی ایڑیاں جو لگیں وہاں سے پانی رسنے لگا اور بعض لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت جبرئیل نے خدا تعالیٰ کے حکم سے اس زمین پر آ کر ایک ایسا پر مارا کہ زمین کا پردہ پھٹ گیا اور پانی ابھر آیا۔ غرض جب وہ پانی بہنے لگا تو آپ نے چاروں طرف سے مٹی روک کر اس پانی سے ارشاد فرمایا کہ (زم زم) یعنی تھم جا تھم جا۔ جب سے اس متبرک چشمے کا نام زمزم ہو گیا۔ چونکہ یہ حضرت اسمعیل علیہ السلام کا ایک معجزہ ہے اور خانہ کعبہ میں بھی اس کا پانی صرف ہوتا ہے اس سبب سے اہل اسلام اس کی بڑی عزت کرتے اور دور دور لے جاتے ہیں، بلکہ مرتے وقت اس پانی کا منہ میں جانا باعثِ نجات تصور کرتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ اس چشمہ میں جنت کی سوت ہے اور از روئے حدیث یہ کل امراض کے واسطے آبِ شفا ہے۔ مشہور ہے کہ آدمی جس چیز کی نیت کر کے اس پانی کو پیتا ہے اسی کا مزہ اس کو ملتا ہے۔ بعضوں نے شہد کا مزا پایا ہے بعضوں نے دودھ کا ذائقہ لیا ہے اس کے علاوہ یہ پانی غذا کا کام بھی دیتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اسم اعظم۔ ف۔ ع۔ اسم مذکر۔ خدا کے تعالیٰ کے تمام ناموں سے بڑا نام۔ خدا تعالیٰ کا ذاتی نام۔ اللہ۔ حی القیوم۔ (اس نام کی تعیین میں بہت سا اختلاف ہے بعض کے نزدیک اللہ بعض کے نزدیک صمد۔ بعض کے نزدیک حی القیوم اور بعض کے نزدیک الرحمان الرحیم ہے۔ قاضی حمید الدین ناگوری نے لفظ ہو کو اسم اعظم قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسم ہو تمام اسمائے الٰہی کی اصل اور آل ہے جس طرح سورۂ فاتحہ قرآن مجید کی اصل اور مآل ہے۔ عبد الرزاق کاشی نے اسم اعظم کے معنی میں یہ رباعی لکھ کر اپنی رائے کا فیصلہ کر لیا ہے

گزرے موسم کی تپش

ترنم جہاں شبنم

''میں کب سے تمہارا منتظر تھا شفو! آج مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ تم میرے سامنے کھڑی ہو۔'' خوشی سے کھلکھلاتی سامنے کھڑی لڑکی سے یہ کہتے ہوئے لڑکے نے اپنی بانہیں پھیلا کر اسے خوش آمدید کہا۔ لڑکی دوڑ کر اس کی باہوں میں جھول گئی۔ میں جو مراقبوں میں رہنے کی عادی ہو چکی ہوں ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اپنے ماضی کے بھنور سے باہر آئی تھی۔ اور اب اس منظر پہ غش کھا کر پیچھے گرنے کو تیار تھی مگر اس سے پہلے ہی میں نے خود پہ قابو پا لیا تھا۔ ان کھنڈروں میں جہاں انجانے سکون کی تلاش میں بھٹکتے لوگوں کی بھیڑ ہے۔ جس میں ایک طرف ایک دوسرے سے سر جوڑے محبت کو ایک نیا عنوان دیتے جوڑے ہیں۔ جو جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں اور بھیڑ میں بھی تنہائی کے کا احساس لیے اپنی دنیا میں مست ہیں۔ اور سکون محسوس کر رہے ہیں۔ تو وہیں دوسری طرف مجھ جیسے بےچین لوگ بھی ہیں۔ جو بھیڑ اور تنہائی دونوں کے شور سے پریشان ان کھنڈرات میں بھٹک رہے ہیں۔ میں اکثر ہی سکون کی تلاش میں بے سکون ہونے میں یہاں آتی ہوں۔ بڑا گہرا اور پرانا رشتہ ہے میرا ان کھنڈرات اور اس ویرانے سے۔ ماضی کی ورق گردانی کرتے ہوئے اکثر میں کانوں پر لگے ایئر فون پہ غلام علی، جگجیت سنگھ غزلیں یا کبھی رفیع، لتا کے نغمے سنتے ہوئے گھنٹوں اپنا وقت یہاں گزارتی ہوں اور ورق ورق بے سکون ہوتی ہوں۔ یہاں بیٹھے ان جوڑوں سے مجھے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی اور نہ ہی کبھی کوئی مجھے اپنی طرف متوجہ کر سکا۔ مگر اس جوڑے میں ایسا کچھ تھا کہ جو میری توجہ کا مرکز بن گیا۔ ماضی کے کبوتر نے پھر میرے سر پہ پھڑ پھڑانا شروع کیا تھا، گھبرا کے میں نے اپنا سارا ذہن ان دونوں کی طرف لگا دیا۔

''شفو مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے پاس آگئی ہو، کبھی نہ جانے کے لیے۔ اُف کتنا تڑپا ہوں میں تمہارے لیے۔ معلوم ہے، مجھے میلوں کے فاصلوں نے نہیں سرحدوں کے فاصلوں نے تڑپایا ہے۔ میلوں کے فاصلے تو میں نے نا جانے کب کے عبور کیے ہوتے مگر اس سرحد کا کیا کرتا؟'' آخری جملہ گہری سانس لیتے ہوئے اس نے کہا۔ پھر وہ بار بار لڑکی کو چھو کر اس کے ہونے کا یقین کرنے لگا۔ خوشی کی کرنیں دونوں کے چہرے سے پھوٹ رہی تھیں۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں سمائے دونوں اپنی اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ ''شفو میں تمہارے حوصلے کو سلام کرتا ہوں جو تم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا۔'' ''یہ میرا حوصلہ نہیں منیر تمہاری محبت ہے۔ جس نے مجھے اتنا بڑا فیصلہ کرنے پر مجبور کیا ورنہ مجھ میں اتنی ہمت کہاں؟'' لڑکی کے اس جواب پہ لڑکے نے اسے اپنے اور نزدیک کر لیا۔ اب لڑکی بھی لڑکے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کی آنکھوں کو چومتی تو کبھی لڑکے کے ہاتھوں کو چوم کر اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے گہرے سکون کا احساس کرتی۔ کبھی لڑکا لڑکی کی پیشانی اور آنکھوں کو چومتا۔ کتنی ہی دیر دونوں یقین اور بے یقینی کے بیچ گھرے ایک دوسرے کو چھو کر ایک دوسرے کو خود کے ہونے کا احساس کراتے، خوش ہوتے اور کھلکھلاتے رہے۔ جہاں ان کے قہقہوں کا ترنم فضا کو غنیمت بخشتا ہوا ان کھنڈرات کو بھی تازگی کا احساس کراتا رہا۔ پھر اچانک دونو کے بیچ ایک گہری سوچ نظر آئی جس کے ساتھ چہرے کی خوشی ڈوبتے سورج کی طرح اندھیرے میں تحلیل ہوتی گئی۔

''شگفتہ بتاؤ نا! یہ سرحد اب تو ہمارے بیچ نہیں آئے گی نا؟'' لڑکا ڈوبتے لہجے میں بولا تھا۔ ''نہیں آئے گی نا اتنا پریشان کیوں ہوتے ہو منیر؟'' لڑکی نے اسے تسلی دی تھی۔ مگر فکر کی لکیریں اس کی پیشانی پر بھی

ابھری تھیں "۔ تمہیں اپنے اور گھر اپنے وطن کی یاد آئی تو؟" لڑکے نے دوسرے سوال کے ساتھ سامنے بیٹھی لڑکی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نا معلوم کیا تلاشنے کی کوشش کی۔ لڑکی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھی مگر ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ فکرات میں پڑ کر ان خوشگوار لمحوں کو گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ فوراً ماحول کو تبدیل کرنے کی غرض سے چہرے پر شوخ سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ "سنو منیر فیس بک، یاہو، جی میل، اور اسکائپ وغیرہ کے ذریعہ ہی تو ہماری محبت پروان چڑھی ہے۔ انہی کے ذریعہ گھر والوں سے بھی ملیں گے۔" "واقعی اب تم واپس نہیں جاؤ گی؟" لڑکے نے بے یقینی سے پھر سوال کیا۔ "پاگل ہوئے ہو کیوں جاؤں گی واپس؟ رخصت ہو کر ایک دن تو ہر لڑکی کو اپنی سسرال جانا ہوتا ہے۔ اب میں اپنی سسرال سے کہاں انے والی ہوں؟" اس بار لڑکی نے لڑکے سے سوال کیا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اس طن پہ شاد و نیاز مستقبل کے سنہرے خواب بنتے رہے۔ انھیں یوں خوش دیکھ کر مجھے بھی ایک عجیب سے سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ آج نا جانے کتنے عرصہ بعد میں نے سکون محسوس کیا تھا۔ شائد اس لیے کہ وہاں سر جوڑے بیٹھے ان جوڑوں سے یہ جوڑا کچھ مختلف تھا یا میری اس کہانی کا ایک حصہ جسے میں یاد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے پھر اپنے ذہن کو جھٹکا تھا۔

اچانک لڑکے کو پھر کچھ یاد آیا۔ جس کے ساتھ فضا میں گونجتے قہقہے کہیں گم ہو گئے۔ ایسا لگا مانو جیسے اُنچی اُڑان کے پرندوں کے پر کہیں پھنس گئے ہیں اور حادثے کے خوف سے وہ پھڑپھڑا رہے ہوں۔ اس پھڑپھڑاہٹ میں پسینے کی بوندیں دونوں کی پیشانی پر نظر آنے لگی تھیں۔ میں جو کان پہ ایئر فون لگائے ان سے کچھ فاصلے پہ بیٹھی بہ ظاہر تو ان سے بے نیازی سی تھی مگر میری توجہ کا مرکز وہ دونوں ہی تھے۔ جو مجھے کہیں گم ہوئی اپنی 'اس کہانی کا دوسرا پارٹ نظر آئے تھے جو سرحدوں میں بٹ گئی تھی۔ انھیں دیکھتے ہوئے وہ محبت میرے اندر تڑپنے لگی تھی جسے سیاست نے ملکوں اور سرحدوں میں بانٹ دیا تھا۔ ماضی کی وہ کہانی جس نے مجھے مراقبوں کا عادی بنا دیا تھا۔ جسے میں یاد کرنا نہیں چاہتی تھی آج ایک مختلف انداز میں پھر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ ان ہی کھنڈروں میں تو کل وہ کہانی گزری تھی اور یہیں آج مجھے 'اس جیسی یہ دوسری کہانی نظر آ رہی تھی۔

یہ قطب مینار کے آس پاس کے وہی کھنڈر ہیں جہاں کبھی قمر نیازی اور میں سکون کی تلاش میں آتے اور گھنٹوں ان ویران کھنڈروں میں سکون تلاشتے۔ یہ وہی کھنڈر ہیں جہاں ایک بار قمر نیازی نے مجھ سے کہاں تھا۔ "نشاط میری تعلیم مکمل ہونے والی ہے۔" "اچھا! تو اس میں کونسی نئی خبر ہے، مجھے معلوم نہیں ہے کیا جو مجھے اطلاع دے رہے ہو؟" میں نے قمر کے عجیب سے انداز پہ جھنجلا کر کہا تھا۔ "ارے تم کبھی نہیں نشاط، چند ماہ بعد میں اپنے وطن واپس لوٹوں گا، پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟" اس نے بڑی فکر مندی سے اپنی بات کہی تھی۔ "اوہو!" گہری سوچ کے ساتھ میرے منھ سے صرف "اوہو" نکلا تھا۔ اور پھر موت کا سا سناٹا ٹریفک کے شور سے آباد ویرانے میں چھا گیا۔ گھبرا کے میں نے قمر نیازی کو دیکھا تھا جو آنکھوں میں نا جانے کتنی التجائیں لیے میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی ملتجی نظروں کو دیکھ کر میں نے یہی کہا تھا۔ "قمر تم یہیں رہ جاؤ نا۔ اور پھر ابھی میرا فائنل ایئر بھی باقی ہے۔" "ٹھیک ہے نشی پھر اس کے بعد؟" قمر نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ اس کے بعد گہری سوچ اور ایک گہری خاموشی تھی۔

قمر نے ہی اس خاموشی کو توڑا تھا۔ "سنو نشی ہم دونوں میں زبردست ذہنی مطابقت ہے۔ اس وجہ سے مزاجاً بھی ہم ایک سے ہیں۔ پھر بھی ہر لڑکی کو ایک دن رخصت ہو کر اپنے شوہر کے دیس جانا ہوتا ہے۔ ایسے میں، میں تمہیں اپنی دلہن بنا کر اپنے ساتھ لے جانے کی اُمید کر سکتا ہوں؟" اس کے اس سوال پر اب کی بار میں نے اسے ملتجی نظروں سے دیکھا تھا۔ یہ وہی سوال تھا جہاں آ کر ہم دونوں ہی خاموش ہو جاتے تھے۔ کیوں کہ ہم دونوں کو ہی اس کا جواب معلوم تھا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ مجھے اپنی مٹی کی سوندھی مہک کتنی پیاری ہے۔ یہاں سے دور جانے کا تصور بھی میرے لیے عذاب ہے۔ اور میں نے اسے بھی اس کی مٹی کی یاد میں تڑپتے ہوئے دیکھا تھا۔ حصول تعلیم کے لئے وہ یہاں موجود ضرور تھا۔ مگر اس کا دل و دماغ بھی کہیں اپنی مٹی کی سوندھی مہک ہی تلاش کرتا تھا۔ اس دن ان کھنڈرات میں بیٹھے ہوئے ہم گھنٹوں اپنے احساسات سے لڑتے رہے۔ جہاں اس نے یک سرد آہ کے ساتھ مجھ سے کہاں تھا۔ "نشاط! کاش یہ مٹی سرحدوں میں نا بٹی ہوتی۔ اب میں کیا کروں مجھے جانا ہی ہوگا اور اگر تم۔ ۔" میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب دیکھ کر اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔۔۔۔ اور پھر ہم دل بھر کے روئے تھے۔

اس دن ہمارے دونوں کے بزرگ یہ کھنڈر۔۔۔۔ مجھے بہت غمگین نظر آئے تھے۔ اور ہمیں تسلی دیتے ہوئے ہمارے آنسوؤں کو اپنے سینے میں دفن کرتے گئے تھے۔ ان آنسوؤں کی نمی سے فضاء میں جو سوندھی مہک پھیلی تھی۔ اس نے ان کھنڈروں کے بھی کتنے زخموں کو تازہ کیا تھا۔ امیر خسرو کی رباعیوں کی روحانی موسیقی سے گونجتے اس شہر کے یہ کھنڈر کتنے ہی دور کے گواہ ہیں۔ اور کتنی ہی محبتوں کو اپنے سینے میں سموئے ہوئے بھی۔ شائد رضیہ سلطان اور یاقوت کی محبت بھی ان کھنڈر ہوئی عمارتوں میں پروان

چڑھی ہو؟ اور مغلوں تک آتے آتے سلیم و انارکلی، شاہ جہاں اور ممتاز کا دور بھی ان کھنڈرات ہوئی عمارتوں نے دیکھا ہو۔ یہ تو محبت کا وہ شہر ہے جس نے اپنے یہاں، ہر آنے والے کا استقبال کیا ہے اور ماں کی طرح اسے اپنے کلیجے سے لگایا ہے، خود میں سمویا ہے۔ کتنی ہی محبتیں اس کے کلیجے میں دفن ہیں۔ گواہ ہیں یہ کھنڈر اس بات کے۔ سرحدیں تو کبھی اس کے بیچ نہیں رہیں۔ پھر اب کیوں اس مٹی کو سرحدوں میں قید کر دیا گیا ہے؟

سوچوں کے حصار سے باہر آتے ہوئے میں نے ایک نظر پھر ان دونوں پر ڈالی۔ جو پیشانی سے پیشانی ملائے نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے اور فکر مند سے تھے۔ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ دونوں کے بیچ اب کیا چل رہا ہے۔ کان میں لگے ایک ایئر فون کو کان سے نکال میں بالوں میں چھپا چکی تھی بہ ظاہر ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں ایئر فون پر مصروف ہوں مگر حقیقت میں میں نے اپنا پورا دھیان دونوں کی طرف لگا دیا تھا۔ ”شگفتہ تم نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ کسی صورت بھی مناسب نہیں ہے۔ تم ٹورسٹ ویزا پر یہاں آئی ہو ہماری مہمان ہو ایسے میں تم اچانک اپنے غائب ہونے کا مطلب سمجھتی ہو؟ نہیں نا؟“ لڑکا لڑکی سے پوچھ رہا تھا اور کچھ سمجھانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ ”سنو تمہیں ابھی اپنے ٹور کے ساتھ واپس جانا ہوگا۔ پھر میں اپنے بزرگوں سنگ تمہارا ہاتھ مانگنے تمہارے گھر آؤں گا۔ لیکن اس وقت تمہیں جانا ہی ہوگا۔“ ”نہیں منیر نہیں میں اب واپس نہیں جاؤں گی میں فیصلہ کر کے آئی ہوں۔ تمہیں معلوم نہیں منیر میرے گھر والے اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہوں گے۔“ ”کیوں شگفتہ انہیں مجھ سے کیا پرابلم ہے؟“ ”تم سے نہیں ان سرحدی فاصلوں سے پرابلم ہے۔ اگر میں واپس گئی تو پھر ہم کبھی نہیں مل پائیں گے۔ پلیز منیر مجھے خود سے جدا مت کرو۔“ ”نہیں شفو تمہیں اس وقت جانا ہی ہوگا تم سمجھ نہیں رہی ہو۔“ ”نہیں منیر نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ اور ابھی کچھ دیر پہلے تو تم بھی مجھ سے مل کر کتنے خوش تھے۔ میرے ہونے کا یقین کر رہے تھے مجھ سے جدا ہونے کے خوف سے لرز رہے تھے۔ اب کیا ہوا؟“ لڑکی اس سے الجھ رہی تھی اور اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔ لڑکا برابر اسے منانے اور سمجھانے میں لگا تھا۔

شام کی بڑھتی دھند کے ساتھ مجھے گھر کی یاد آئی اور ’گھر‘ سوچتے ہوئے میں خود پہ ہنس دی تھی۔ ہم تنہا لوگوں کی یہی تو ایک خاص بات ہے کہ ہم گھر میں نہیں مکان میں رہتے ہیں جہاں ہمارا انتظار کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ان دونوں کو الجھتا چھوڑ میں نے چلنے کی تیاری شروع کی۔ لڑکا اب بھی لڑکی کو سمجھا رہا تھا۔ ”شفو! جان میرا یقین کرو مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔ اور جو کچھ میں نے تم سے کہا سچ ہے۔ مگر اس طریقہ سے ہم کسی طور بھی نہیں مل سکتے۔ سنو تمہیں معلوم ہے، جس مذہب سے ہم تعلق رکھتے ہیں وہ مہمان کو اللہ کی رحمت مانتا ہے۔ اور جس مٹی کی خوشبو میں میں بسا ہوں میری وہ مٹی ”اتیتھی دیو بھوا“ کے ساتھ مہمان میں خدا کو دیکھتی ہے۔ میں اپنی مٹی کی سوندھی مہک کو خاک میں کیسے۔۔۔“ لوگوں کو کنارے لگاتے شور کے ساتھ لڑکے کا جملہ بیچ میں چھوٹا تھا۔ اور ایک زلزلہ محبت کے گواہ ان کھنڈروں میں نمودار ہوا تھا۔ جس کا مرکز سرحدوں میں بٹی سوندھی مٹی کی مہک تھی۔

Tarannum Jahan Shabnam
R-24/7, Joga Bai Extn.
Qadri Masjid, Zakir Nagar, Okhla
New Delhi-110025

فرہنگ آصفیہ سے

انور – ع۔ (نور کا افضل التفضیل) (۱) زیادہ روشن (۲) خوبصورت نورانی (۳) سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا دہلوی خلف سید جلال الدین خوشنویس شاگرد ذوق کا تخلص جنہیں وفات پائے دس پندرہ برس ہوئے ظہیر آپ ہی کے برادر کلاں ہیں۔

انوری – ع۔ اسم مذکر۔ ایشیا کے ایک نہایت مشہور فارسی گو شاعر کا تخلص جس کا نام اوحد الدین اور مولد خاوران ہے۔ چنانچہ اول اس وجہ سے اس نے اپنا تخلص خاوری قرار دیا تھا مگر بعد ازاں الف استاد عمارہ ثانی کے ارشاد سے اسے بدل کر انوری ٹھیرایا۔

مدرسہ منصوریہ میں پڑھا۔ اس زمانہ کے تمام حکماء اور فلاسفہ پر غالب آکر حکیم اوحد الدین کے نام سے مشہور ہوا۔ جیسا علم کا مایہ دار تھا ویسا ہی دنیوی زر و مال سے نادار۔ اسی وجہ سے اپنی عمر فقر و فاقہ میں بسر کرتا تھا۔ ایک مرتبہ حسب اتفاق سلطان سنجر سلجوقی اور ابو الفراح سنجری ملک الشعراء کا لشکر مقام زاکان میں جو مشہد مقدس کے قریب واقع ہے، آن کر ٹھیرا۔ اسکی شان و شوکت دیکھ کر ارادہ کیا کہ زمانہ کی رفتار کے موافق منطق و فلسفہ سے باز آکر شعر و سخن پر مائل ہو۔ چنانچہ اس شب کو سلطان سنجر سلجوقی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس پر بہت انعام و اکرام ملا۔ یہاں تک کہ خود بادشاہ اس کے گھر آیا۔ اہل سخن اسے پیغمبر سخن مانتے ہیں۔ حکیم انوری کو نجوم کا بھی دعویٰ تھا۔ چنانچہ اس نے سلطان طغرل شاہ سلجوقی کے عہد میں دعوے سے کہا کہ فلاں روز مثل طوفان نوح باد آئے گا مگر وہ دعویٰ غلط نکلا جس کی نسبت ایک شاعر نے قطعہ ذیل موزوں کیا

کہانی

فاطمہ ترمذی

یوں بھی جیا کرتے ہیں

'بجرا لاگی رہیو تورے بنگلے پہ...... بجرا لاگی رہیو...... وہ اپنے مخصوص انداز میں گنگناتی ہوئی اندر آئی۔

'نمستے بی بی جی...... رام رام...... ماتا جی—'

'نمستے پاربتی' چترا نے اخبار سے نظریں اٹھائیں—

'ٹھیک ہو پاربتی' ماتا جی نے خصوصی توجہ دی—

'ہاں جی ہم ٹھیک ٹھاک ہے ایک دم بمسٹ کلاس۔'

'تم کتنے اور گھروں میں کام کرتی ہو پاربتی؟' گیلے بالوں میں رولر لگاتے ہوئے بولی—

'ارے بے بی ہمارے پاس بہت کوٹھی ہے۔ دس برس سے اوپر ہو گیا ہم ادھر کام کرتی ہے۔ کتنے بابو لوگ آئے اور چلے گئے۔ اچھا اب پھٹا پھٹ کپڑے دیو پھٹا پھٹ جب تک ہم جھاڑو لگاتی ہے۔'

پاربتی گذشتہ دو ماہ سے چترا کے گھر کپڑے دھونے اور جھاڑو برتن کرنے کے لیے آتی تھی۔ کتنی کٹھن ہو گئی تھی زندگی کہ بغیر سہارے کے کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نوکری بھی ضروری اور اسکول کالج کی پڑھائی بھی۔ پھر گھر گرہستی کی چکی۔ اور صحت بھی کسی کی اس قابل نہ رہی کہ زیادہ محنت کر سکے۔ اسی لیے چترا نے مجبور ہو کر کام کرنے والی کو لگا لیا تھا۔

'تمھارا آدمی کیا کام کرتا ہے پاربتی؟' ماتا جی نے سبزی بناتے بناتے پوچھا—

'ارے ماتا جی، ہمرا آدمی کی بات مت کرو۔ ہمرا آدمی بڑا نکما نکل گیا۔ دارو نے اس کا دماگ آوٹ کر دیا۔ ہم کا جانی کا کرت ہے کا نہیں۔ اب او کا ہمرا کوئی سمبندھ نہیں—'

'ہائے ہائے دارو پیتا ہے نامراد کیسی بری عادت ہے۔' ماتا جی نے ہونٹ سکوڑے—

'اور کا، کبھی اس نے پکا کام نہ کیا ایک لڑکی ہے اس کی سادی بھی ہم ہی تیری میری چاکری کر کے کر دیا اور او کا کوئی پھکر نہیں بس دارو اور اوائی توائی— ایک بار آیا بہوت بیمار پڑا ہم اس کی سیوا کی۔ اس کا علاج کرائی یہ جو بابو والی ڈاکدرنی ہے نا او ہی اپنے آسپتال میں لے گئی۔ بڑا ڈاکٹر کو دکھائی اور جب او اچھا ہوا تو بدماس ہمرا ڈھکا چھپا چار سو روپیہ لے کر بھاگ گیا بے سرم کہیں کا اب تو دوئی تین سال ہو گئے نہ چٹھیا نہ پاتر ہوئے کا کیوں اوٹھ ہو ہے ہمکا کا کرنا—'

پاربتی نے زور سے جھاڑو کو جھٹکا جیسے گذشتہ تمام یادوں کو ذہن سے جھٹک دینا چاہتی ہو۔

'آج کی کیا کھبر ہے بی بی جی؟' اب کپڑے ڈوری پر پھیلاتے ہوئے وہ چترا سے مخاطب ہوئی جو اخبار میں کھوئی تھی۔

'سنی ہے کہ ہماری لوگن کی جگی جھونپڑی ہٹائی دی جائے گی اور بلڈنگ بنائی جائی...... کہت ہیں کہ سرکار ایک کمرہ دے گی ہم ہمکا سب پتہ ہے۔ ای سب گورمنٹ کی جھوٹی موٹی باتیں ہیں ایک ایک پریوار کا چار چار پرچی کاٹ دی یہ بابو لوگ۔ پوچھو کے؟ بس جے مٹھی گرم کر دی وہی کا کام بن گیا۔ صبح سے سام تک بھوکی پیاسی پبلک لین لگائے رہی اور سام کو را جواب......—'

'ہوں یہ تو ہو ہی رہا ہے۔ دیکھنا میری سلکن ساڑھی ذرا احتیاط سے دھونا کل ہی نکالی ہے...... دھبے نہ لگ جائیں۔' چترا نے اخبار سے نگاہیں اٹھائے بغیر کہا—

'ہا ہم جانتی ہے ڈرائی کالین کیوں نہیں کراتیں ایسے کپڑے گھر میں دھونا ٹھیک نہیں' پاربتی نے مزید معلومات میں اضافہ کیا—

وہ روز اسی طرح ادھر ادھر کی خبریں...... گورمنٹ کی پالیسی اور

حالات حاضرہ اور سیاسی مسئلوں پر تبصرہ کرتی رہتی تھی۔ اور سب تو بہت جلدی میں رہتے تھے بس ماتا جی کو کوئی چاہیے تھا بات چیت کو۔ چترا آدھے دن اسکول میں رہتی اور آدھے دن لکھائی پڑھائی اگر گھر کے دوسرے کاموں میں بچے اپنے کالج میں اور روپیش بچارا تو صبح کے نو بجے جا کر رات کے دس گیارہ بجے آتا۔ تھکا ماندہ بس آتے جاتے نمستے کرنا نہیں بھولتا۔ ارے داماد کی یہی بات کیا کم تھی کہ وہ بہت اصرار سے ماتا جی کو مہندر کے گھر سے لے آیا کہ وہاں دن بھر ماتا جی اکیلی رہتی تھیں...... مہندر اور اس کی بیوی دونوں آفس میں کام کرتے تھے۔۔ وہ داماد کے گھر آنے پر راضی ہی نہ تھیں مگر روپیش اس وعدے پر لا یا کہ جب تک آپ کا دل گھبرائے نہیں آپ رہیے گا۔ اور اب وہ پاربتی کا سہارا لینا چاہتی تھیں سو وہ بھی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے کام کو آتی تھی، وہ بھی مصروف۔ توبہ کیسا زمانہ آ گیا۔ پہلے بھی مرد لوگ روزی روٹی کماتے تھے مگر ایسی مشینی زندگی نہ تھی کہ چل دوڑ— چل دوڑ— کسی کو دوسرے کے لیے وقت نہیں— گھر اور باہر ایک ہو رہا ہے اب تو—

دو دن کی چھٹی کے بعد پاربتی آئی تو اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی بھی تھی جس کی گود میں ایک کالی، سوکھی سڑ گلی سی بچی روں روں کر رہی تھی۔

چترا نے سوالیہ نظریں اٹھائی۔

'ارے نمستے کر بی بی جی کو یہ ہمری روپا ہے بی بی جی ہمری لڑکی کام سے میں اسے بلائی اب یہو کام کرے گی۔' اور اس نے روپا کو کام کی تفصیل بتائی اور اچھی طرح کام کی ہدایت کر کے چلی گئی—

پاربتی کی بیٹی روپا سے پتہ چلا کہ پاربتی کا داماد کہیں شہر میں محنت مزدوری کرتا ہے مگر بیوی بچوں کو ساتھ نہیں رکھتا۔ سارا خرچ اپنی ماں کو بھیج دیتا ہے اور روپا کو کچھ نہیں ملتا۔ بچے بھی تکلیف اٹھاتے ہیں...... کھیت کا کام بھی کرتی ہے روپا اور پاربتی کا ایک بھائی، بہن ماں سب یہیں ہیں۔ اور پھر چند روز کے بعد پاربتی دو دن کے لیے بغیر بتائے غائب ہو گئی— نہ وہ آئی نہ لڑکی، آس پاس سے بھی یہی پتہ چلا کہ کہیں کوئی اطلاع نہیں۔ کام کی مشکل کے ساتھ یہ فکر بھی ہو گئی کہ پاربتی پر کیا گزری کہ چوتھے دن مقرر وقت پر پاربتی آ گئی بس ایک بات نئی تھی کہ آج وہ نڈھال سی تھی۔

'پاربتی تم کہاں چلی گئی تھیں بتایا بھی نہیں۔' چترا نے شکایت بھری نظریں پاربتی پر ڈالیں۔ 'اپنی لڑکی کو بھی نہیں بھیجا— ہیں؟ کیا قصہ ہے؟'

'ارے اب کا بتائی بی بی جی وہ ہمرا جنوائی بڑا جھگڑا کیا کہ ہم اپنی مہریا سے جھوٹن نا ہیں سا پھ کرائی۔ اس کا گام میں بھیج دو ہمری کھیتی باڑی کا کام بگڑ جائی۔ بڑا ناک والا آیا— اور ہماری جھونپڑی ٹوٹ گئی سو ہم کہوں اور اپنی مڑیا ڈال رہی تھی اسی کارن نہیں آئے ابھی تو پوری بنی بھی نا ہیں ہے۔'

'ارے جھونپڑی ٹوٹ گئی ہائے ہائے اب کہاں رہے گی تو؟' ماتا جی بڑے افسوس سے پوچھ رہی تھیں۔

'اب کہیں اور جھونپڑی بنائے گی— رات بھر کھلے آکاس تلے پڑے رہے ہم لوگ ماتا جی ارے ہم سب جانتی ہے یہ بیچ والا بابو لوگ کی سرارت ہے۔ الکسن کے زمانے میں بوٹ لینے کو بڑی بڑی باتیں کرت ہیں بعد میں سب ختم— اب جو اپنی کلونی سے کھڑا ہوا تھا الکسن میں او کا کرسی مل گئی صاحب بن گیا سب بھول گیا ہم کا پتا ہے یہ موٹر کے کارخانے میں کے ہک تھا کے ہک اب سرکار میں آ گیا۔ گریبن کو کون یاد رکھے—'

'ارے آج کالج نہیں جانا ہے بی؟' وہ بچی کی طرف متوجہ ہو گئی اور پھر چھوٹی دیدی کی طرف دیکھ سوالیہ نگاہیں بچی کی طرف ڈالیں۔ 'یہ ہماری ماسی ہیں پاربتی انٹرویو دینے آئی ہیں، یہاں کالج میں—'

'اچھا اچھا تم کو وہ بھتر کی نوکری پسند نا ہیں تو پرایوٹ جگہ کر لوا رے کالج اسکول سرکاری وبھتر سب کام گڑ بڑ گٹالا ہی— اب تک گونمنٹ کی طرف سے بھرا ہوا اخبار دل سے نہیں نکلا تھا— 'اچھا ہم پتا کرے گی جگہ کھالی ہوئے گی تو بتائے گی۔' پاربتی نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں۔

وہ اتنے عرصے میں گھر کے ہر فرد سے متعلق ہو گئی تھی کبھی راکیش سے امتحان کے بارے میں پوچھتی اور کبھی بچی کی پڑھائی کے متعلق— گھر کے ہر آنے جانے والے رشتہ دار کی خیریت معلوم کرتی اب وہ چھوٹی دیدی سے بھی بے تکلف ہو گئی تھی— تہوار کے موقعوں پر حق مانگی گلال لگا کر ہولی کی بخشش مانگتی شادیوں میں شریک ہو کر ساڑھی اور نیگ کے لیے جھگڑتی تھی— وہ ہر وقت اپنا دکھڑا نہیں روتی تھی نہ قسمت کا گلہ کرتی اگر کبھی کوئی بھولی بسری بات کرتی تو جلدی ہی موضوع بدل دیتی۔

'ارے ہوئے ہے جو بھاگ میں لکھی ہے وہ ہوئی ہے جب اوپر والے نے دھرتی پر جنم دیا تو وہی آگے بھی کچھ نہ کچھ کر لیہے اس کا کا سوچنا— روئے دھوئے سے کا ہوت ہے— سے تو کٹ ہی جاتا ہے—'

اس پر غصے خفگی کا سوڈ ہوتا مگر بہت عارضی۔ وہ خفا ہو کر جلدی ہی بگڑتی مگر اگلے روز اسی طرح گاتی گنگناتی ہلو ہلو کرتی آتی یہ ہلو ہلو بچی کے لیے ہوتا۔ کبھی ڈسکو ڈانس کرتی اپنے خیال میں اور کبھی دیہاتی اور بچوں کو ہنساتی رہتی تھی۔ راکیش سے مطالبہ کرتی کہ کب تک وہ نوکر ہو جائے گا جو وہ بڑھیا ساڑھی لے—

ایک دن پاربتی دیر میں کام کرنے آئی۔ اسپتال ماں کو دکھانے گئی

تھی۔ کام کرتے کرتے دوپہر ہوگئی...... نجی کی چھٹی تھی اور چترا کی بھی — اور چھوٹی دیدی ابھی ابھی باہر سے آئی تھیں۔

'تمھارا جھگڑا اپنے آدمی سے کس بات پر ہوا پارتی؟' چھوٹی دیدی کو پارتی اور اس کے شوہر کے کیس میں بہت زیادہ دلچسپی ہوگئی تھی۔ 'آؤ آؤ پنکھے میں بیٹھ جاؤ' ماتا جی نے بہت اخلاق سے کہا — چھوٹی دیدی کو اس موضوع سے یوں بھی دلچسپی تھی کہ وہ بھی تو اسی تیغ کی کشتۂ ستم تھیں کہ ان کے ماڈرن شوہر انھیں اپنے ساتھ باہر کے ملک میں رکھنا چاہتے تھے اور یہ اپنے ملک سے الگ نہیں ہونا چاہتی تھیں اس لیے بات بگڑ گئی اور وہ خود جا کر بدیس میں بس گئے اور چھوٹی دیدی اپنے بھائی کے پاس رہتی کبھی کسی بہن کے پاس اب وہ نوکری کر کے الگ رہائش اختیار کرنا چاہتی ہیں۔

ہاں تو تمھارا آدمی کیوں چھوڑ گیا — 'چھوٹی دیدی نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ چترا کو بے حد ناگوار گزر رہا تھا کہ کیوں بار بار یہ تکلیف دہ موضوع چھیڑا جا رہا تھا۔ لیکن وہ بہن کی نازک مزاجی سے گھبراتی تھی کہ ڈپریشن کے دورے نہ پڑنے لگیں اور ماتا جی کو بھلا کیا کہا جا سکتا تھا۔

'اب ہم اپنی کہانی کا سنائی۔ بپا بچپن میں چھوٹا چھوٹا چھوڑ کر گجر گیا۔ چھوٹا بھائی تو اس کے بعد ہوا — بڑا لاڈ پیار میں رکھی ہم ماں بہن نے۔ پراونتو پڑھا لکھا نہ کام کاج کیا بگڑ گیا — سادی کرائی تو مہریا بڑی کھراب نکلی لڑائی جھگڑا ہمری ماں سے کری اس کی جمین مکان سب لے لیا اور بھائی سے بھی ان بن ہوئی اور ماں سے بھی۔ ہمری بہن کا بیٹا مر گیا سیانا اور اس کا آدمی کہیں غائب ہو گیا جانے مرا کہ کیا تب سے ہمری بہن کا دماغ بھی چل سا گیا۔ سو ہم سب کا لے کر یہاں آئیں اور کام پر لگا دے دی...... 'وہ سب سے ہی مخاطب تھی۔

'اور ہمرا آدمی — اس کو بیٹا چہیے تھا۔ سو ہم کا بھگوان سے لڑائی کرتی کہ لڑکا کیوں نہیں دی — تو او ہم سے چھپائے کے دوسری عورت کر لیا پر ہمکا پتہ چل گیا تب ہم پوچھا کہ مرد ہو کر چوری چوری عورت کیوں کرتا ہے اور ہم اس کا گھر چھوڑ دیا کہ لیو ہم جاتی ہے۔ بولا جاؤ نہیں یہ تمرا گھرا ہے یہ مہریا تمری سیوا کر لیے روٹی پکا کر کھلائے گی — '

'اور بیٹا بھی دے گی' ہم کہی تو بول بھی نا ہیں پایا چپ رہ گیا پھر ہم کہی 'اب تم دونوں رہو کھوسی اور بیٹا کی آس لگاؤ ہمکا ہاتھ پاؤں چلائے دیو — سو ہم سب کا لے کر یہاں آئی اور کام پر لگ گئی۔'

'تو اس کے بیٹا ہوا؟' ماتا جی کی پوری توجہ پارتی کی گفتگو پر تھی۔

'ہاں بھگوان بھی او کا ساتھ دین — لڑکا بھوا۔ او آئی ہمرے پاس آشیرواد دیو — ہم آشیرواد دیا۔ کپڑے بنائی — مہریا بولی جیجی اب گھر چلو ای تمرا بیٹا بھی ہے ہم روٹی پکا کر کھلائے گی۔ میں بولی۔ ارے جاؤ جی تم لوگ خوسی کھوسی رہو — '

تھوڑی دیر کے لیے پارتی کے چہرے پر بدلی سی چھائی آنکھوں میں کچھ پرچھائیاں لہرائیں — چترا کو دکھ تھا کہ بے کار اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھی گئی۔

'اب آپ بتاؤ ماتا جی کہ وہ اپنے ساتھ لے جاتے پھر لڑائی جھگڑائی جرور ہوتی تو وہ اپنی عورت کی طرف سے بولتا کہ او اس کے سپوت کی ماں ہے بس تب سے او آئے نہ ہم گئی۔'

'چلو چھوڑو جو ہوا سو ہوا — اپنے ہاتھ پاؤں کا سہارا چاہیے یا بھگوان کا' چترا نے دلداری کے طور پر کہا —

'لو پارتی شربت پی لو بڑی گرمی ہے تمھیں دھوپ میں جانا ہے۔' نجی نے دلاسے کے انداز میں کہا —

'لاؤ بے بی بھگوان کرے اچھے گھر جاؤ — بڑا اسندر پتی ملے۔ ایم دم صاحب بہادر۔'

'اے پارتی مجھے شادی کرنا ہی نہیں ہے۔ اب تم کو ہی کیا ملا شادی کر کے — اچھا ہے کہ اپنے گھر میں رہو۔ 'نجی ہر ایک سے اسی طرح باتیں کرتی تھی۔

'نہیں بے بی بری بات — ایسا نا ہیں بولو — تم سادی کرے گی۔ تم کا پتا نہیں یہ دنیا بڑی کھراب جگہ ہے۔ کنواری بالی اکیلی کیسے رہ سکتی — بولیاں بولتے ہیں لوگ — ہاں...... اب ہم اکیلی ہے پر پتی والی تو ہے کوئی کچھ نہیں کہہ سکت بہوت کہا تو دنیا یہی تو کہے گی کہ پتی نے چھوڑ دیا — بہوت سی ایسی ہیں — پر کنواری بالی کے بڑی بڑی باتیں ہوتی ہیں ...... کیوں دیدی کا ہم جھوٹ کہی؟' پارتی چھوٹی دیدی سے مخاطب ہوئی جن کی ویران اداس آنکھوں میں ایسی کیفیت دکھائی دے رہی تھی جیسے رہزنی کی واردات کے بعد کوئی اپنا باقی ماندہ سرمایہ سمیٹ رہا ہو۔

اور آج چترا کو پارتی کا ایک نیا روپ نظر آ رہا تھا۔ اور وہ پارتی کے سوکھے بیمار کمزور جسم میں ایک آن بان والی مضبوط عورت دیکھ رہی تھی جس کو مستقبل کے لیے سوالات ہراساں نہیں کرتے۔ جس کا نہ کوئی سہارا تھا نہ آسرا۔ آنے والے کل فکر سے آزاد وہ ماں کی سرپرست تھی۔ بھائی کی مشیر اور بہن کی مددگار۔ زندگی کے طوفانی تھپیڑوں کا بہادری سے مقابلہ کرنے والی ایک حوصلہ مند شخصیت اس کے سامنے تھی جس کی آنکھوں میں عزم و ارادے کا رنگ تھا اور توکل، استغنا کی روشنی بھی تھی۔

کہانی در کہانی

فرزانہ اسعد

بھائی جان اور بھابی کو اس گھر سے رخصت ہوئے دو برس ہو چکے ہیں۔اسی گھر میں انھوں نے اپنی شادی کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی تھی۔ پورا گھر جگمگا اٹھا تھا۔۔اب وہ یہاں نہیں ہیں، اپنے فلیٹ میں ہنسی خوشی اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ان کے چلے جانے کے بعد امی ابو اور ہم بہنوں پر کیا گزری اس کا انھیں ذرا بھی احساس نہیں۔ ان دو برسوں میں انھوں نے کبھی ہمیں پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔

کہتے ہیں وقت ہر زخم کا مرہم بن جاتا ہے۔ہم لوگوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ان کا یہاں سے جانا سب کے ذہنوں میں ایک سوال بن کر رہ گیا۔رشتے دار اور پڑوسی اب تک ان کے گھر چھوڑ کر جانے کی وجہ پوچھتے ہیں، کریدنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں گھر کے لوگوں سے ان کی ان بن تو نہیں ہوئی تھی۔سچ تو یہ ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ابو تو اپنی بہو کو بیٹیوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔اس شفقت میں عزت اور دل جوئی بھی شامل تھی جو ہم بہنوں کے حصے میں کبھی نہ آئی۔امی کا بہو کے ساتھ برتاؤ دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ان کی ساس تھی۔مجھے پورا یقین ہے جس قدر محبت بھابھی کو ہماری امی نے دی، اتنی ان کی حقیقی والدہ سے بھی نہ ملی ہوگی۔ان دو سالوں کے دوران لڑائی جھگڑا تو دور کبھی تو تو میں میں کی بھی نوبت نہ آئی۔کبھی ہم سے کوئی غلطی ہوگئی تو ہم نے ہی آگے بڑھ کر معافی مانگ لی۔والدین نے زندگی بھر ہمیں یہی کچھ سکھایا تھا۔انکساری اور تواضع اختیار کرنا بچپن ہی سے ہماری فطرت میں بسا ہوا تھا۔ہم تمام بہنیں بھابھی کے معاملات میں ہمیشہ محتاط رہا کرتی تھیں۔اس کے باوجود وہ انہونی ہو کر رہی۔

ہوا یوں کہ اچانک بھابھی کے برتاؤ میں عجیب سی تبدیلی آنے لگی۔ وہ رات میں اٹھ اٹھ کر گھر میں ٹہلتی ہوئی دیکھی گئیں۔کبھی دیوار کی طرف ایک ٹک دیکھتی رہتیں۔بھابھی کو رسائل اور ناولوں کے مطالعے کا شوق تھا اس دوران وہ بھی چھوٹ گیا۔دھیرے دھیرے ان کی حالت بگڑنے لگی۔ دن بہ دن ان کی حرکتیں عجیب و غریب رخ اختیار کرنے لگیں۔انھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ پاگل سی ہوگئی ہیں۔ڈاکٹروں نے بتایا کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔علامتوں سے ایسا ظاہر ہونے لگا تھا جیسے ان پر کسی جن کا سایہ ہو۔اسے دور کرنے کے لیے عامل کو بلوایا گیا اس نے کچھ عمل بتائے مگر بے سود۔اسی دوران بھابھی کے میکے کے لوگ بھی ان کی عیادت کے لیے آتے رہے۔وہ سب حیران تھے کہ یہ کیا ہوگیا۔ان دو تین مہینوں کے دوران پورا گھر افراتفری کا شکار تھا۔سب کو بھابھی کی بیماری کی فکر تھی۔

میری سہیلیوں میں صوفیہ ایسی تھی جو بھابی کو قریب سے جانتی تھی۔ مجھے یاد ہے بھابھی کے شادی ہو کر ہمارے گھر آنے کے ایک دو مہینے بعد ہی اس نے مجھ سے کہا تھا۔دیکھ لینا تیری بھابھی زیادہ دن یہاں ٹکنے والی نہیں اور میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا کہ ہم انھیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے اور نہ ایسے حالات پیدا ہونے دیں گے کہ بھابھی کے دل میں یہ گھر چھوڑ کر جانے کا خیال بھی پیدا ہو۔مگر نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی کہ صوفیہ کے منہ سے نکلی ہوئی بات سچ ہو کر رہی۔

ایک دن بھیا نے گھر میں یہ کہہ کر ہم سب کو چونکا دیا کہ بھابھی کو یہ گھر راس نہیں ہے، یہاں انھیں کچھ عجیب سی چیزیں دکھائی دیتی ہیں، اس لئے وہ کسی کرائے کے مکان میں منتقل ہونا چاہتے ہیں۔ابو نے یہ سنا تو ان

پر ایک گہری خاموشی طاری ہوگئی دو تین دن تک جیسے وہ اپنے ہوش و حواس ہی میں نہ تھے۔ پھر انھوں نے جیسے اپنے آپ پر قابو پانا شروع کیا۔ جب وہ اس صدمے سے کسی طرح سنبھلے تو ایک دن انھوں نے بھائی جان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ابو نے ان سے کہا: تم فلیٹ میں جا کر رہو گے لیکن وہاں تمہارے آفس جانے کے بعد بہو کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ بہو کی طبیعت ابھی سنبھلی نہیں ہے، تم کچھ دن یہیں رہو۔

اس پر بھائی جان نے کہا: میں گھر کی کام والی بوا سے بات کر چکا ہوں وہ بھی ہمارے ساتھ جائیں گی۔ بھائی جان کے اس جملے نے ابو کو دوبارہ گہری خاموشی کی اسی دردناک حالت میں دھکیل دیا جس سے وہ ابھی ابھی بمشکل باہر آئے تھے۔ ہم سب نے بھابھی اور بھیا کو روکنے کی کوشش کی۔ باجی نے رو رو کر کہا: اگر ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دو۔ امی نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی اپنی بیماری کا واسطہ دیا، مگر بھائی جان جیسے طے کر چکے تھے کہ انھیں اس گھر میں نہیں رہنا۔ گھر چھوڑنے کا کوئی اور سبب نہ انھوں نے بتایا اور نہ اس سلسلے میں بھابی نے کوئی بات کی۔ اور پھر وہ دن آ پہنچا جب بھیا اور بھابی نے اس گھر کو خیر باد کہا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ ابو کی آواز اور امی کی ہنسی اور گھر بھر کی رونق اپنے ساتھ سمیٹ کر لے گئے۔ کئی دنوں تک ان کی کوئی خیریت معلوم نہ ہو سکی۔

کوئی ایک ماہ بعد پتہ چلا کہ وہ اس گھر میں چین و سکون سے تھے۔ ایک دن دوپہر میں بوا اچانک ہمارے گھر آئیں تو اس نے بتایا کہ وہ اس محلے میں کسی کام سے آئی تو ادھر چلی آئی۔ انھوں نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جب یہ بتایا کہ وہاں جاتے ہی ایک ہفتے کے اندر ہی بھابھی پوری طرح ٹھیک ہوگئیں۔ بھائی جان کو آفس سے لون مل گیا اور اب وہ فلیٹ انھوں نے خرید لیا ہے۔

ہم نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ بھائی جان کی بات ہی سچ تھی۔ ممکن ہے اس گھر میں ہی کوئی بات رہی ہوگی، جس سے بھابھی کی حالت بگڑ گئی تھی۔ ہم اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے آپس میں یہ بات کہتے تو تھے لیکن دل مانتا نہ تھا کیونکہ ہمارے گھر میں اس قسم کا کوئی واقعہ کبھی پیش نہیں آیا۔ امی اور ابو کے علاوہ ہم لوگ بھی صبح شام نماز اور قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

بھائی جان اور بھابی کے جانے سے گھر میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا۔ ابتدا میں ہم بھابھی کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کرتے رہے۔ دن گزرتے رہے اور دھیرے دھیرے ان کی یادیں پرانے کپڑے کی طرح اپنے نقش و نگار سے محروم ہونے لگیں۔

رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوا۔ افطار و سحر میں ہم ان دونوں کی کمی محسوس کرتے۔ امی نے کئی بار کہا بھی کہ بھیا اور بھابھی کبھی ادھر نہیں آتے۔ ابو کو امید تھی کہ وہ عید کے دن ملنے ضرور آئیں گے۔ عید قریب آ رہی تھی۔ میرے کالج کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں۔ گھر کی صفائی کا کام میں نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ روزے کی حالت میں صفائی دھیرے دھیرے ہو رہی تھی۔ اس دن بھائی جان کے کمرے کی باری تھی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد سے وہ کمرہ اسی حالت میں پڑا تھا۔ میں نے ان کا کمرہ کھولا اور اندر قدم رکھا تو اس گھٹن بھری فضا میں ایک عجیب سی مہک تھی اسی کے ساتھ پرانی یادیں زندہ ہوگئیں۔ بھابی جاتے وقت اس کمرے کا زیادہ تر سامان اپنے ساتھ لے گئیں تھیں۔ کچھ بے کار سامان اور رسائل اور کتابیں ایک کونے میں دھول میں اٹے پڑے تھے۔ کمرہ کباڑ خانہ بنا ہوا تھا۔ گھنٹوں کی جانفشانی کے بعد وہ جگہ صاف ستھری نظر آنے لگی۔ اب صرف کتابوں کو ریک میں لگانا تھا۔ تھکن کے مارے میرا برا حال تھا۔ اسی دوران میں نے الماری کے پیچھے صفائی کرنے کے لئے نظر ڈالی تو مجھے وہاں ایک رسالہ پھنسا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر مجھے یاد آیا ایک دن میں بھابھی کے کمرے میں داخل ہوئی تو بھابھی یہی رسالہ پڑھ رہی تھیں میں نے پڑھنے کے لیے مانگا تو کہنے لگیں میں یہ کہانی پوری کر لوں تو دوں گی۔ اس کے بعد یہ رسالہ کبھی نظر نہ آیا میں نے ان سے پوچھا تو کہنے لگیں، پتہ نہیں کہاں رکھا ہے، ڈھونڈ کر دیتی ہوں۔

میں کرسی پر ٹک گئی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ ان ہی اوراق میں ایک کہانی پر میری نظر پڑی۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اس تحریر کے سحر نے مجھے جکڑ لیا ہو۔ جب میں اس کہانی کے اختتام پر پہنچی تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس کہانی کا خلاصہ یہ تھا کہ اس کہانی کی مرکزی کردار ایک دلہن پر اس کی شادی کے چند دنوں کے بعد ہی پاگل پن کے دورے پڑنے لگے اور وہ یہ کہہ کر کہ اس گھر میں آسیب ہے اس نے اپنے شوہر کو الگ مکان میں رہنے پر مجبور کر دیا۔ ایک دن دلہن کی سہیلی اس سے ملنے کے لئے گئی اور اس سے پوچھا یہ سب کیا ہوا؟ کیا واقعی وہاں کوئی آسیب تھا؟ یہ سن کر دلہن نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا بدھو! میں نے ان سب کو بے وقوف بنایا ہے۔ آسیب وغیرہ کچھ نہیں۔ وہ تو صرف ایک ناٹک تھا سسرال سے چھٹکارا پانے کے لیے۔ کیا تم کالج کے ڈرامے میں میرا ڈھونگی بہو والا پارٹ بھول گئیں۔

کہانی ختم کر کے میں سناٹے میں رہ گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ذہن

ماؤف ہو کر رہ گیا۔ بہت دیر بعد میں نے کسی طرح اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر میری آنکھوں کے آگے بھابھی کی شادی کے بعد کے تمام واقعات کسی فلم کی طرح ابھرنے لگے۔ میں نے بھابھی کی حرکات وسکنات پر نئے سرے سے غور کرنا شروع کیا۔ مجھے محسوس ہوا گویا اس رسالے میں چھپی کہانی ایک عینک بن کر میری آنکھوں پر آ گئی ہو اور ماضی کے واقعات، بھابھی اور بھیا کے رویے مجھے بالکل الگ لگنے لگے۔ دو تین دنوں تک سارا ماضی میرے ہوش وحواس پر جیسے ایک نئے انداز سے دوبارہ وارد ہو رہا تھا۔ ایک دن مجھے اچانک صوفیہ کی باتیں یاد آ گئیں۔ میں اسی شام اس کے گھر پہنچ گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب اس نے میرے اچانک وہاں آنے کا سبب پوچھا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں اس سے پوچھ بیٹھی: صوفیہ یہ بتاؤ تو نے کس بنیاد پر اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ بھابھی ہمارے ساتھ زیادہ دن نہیں رہ پائیں گی۔ صوفیہ نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا: تم بڑی بھولی ہو، تمہیں لوگوں کی پہچان نہیں۔ تمہاری بھابھی کبھی تمہارے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جب وہ دلہن بنی اور اس کے ہاتھوں میں مہندی لگائی جا رہی تھی، کسی نے تعریف کرتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا: کتنے خوبصورت لگ رہے ہیں تمہارے ہاتھ، اب انہی ہاتھوں سے تمہیں اپنے سسرال کو جنت بنانا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ بری طرح چونکی اور فوراً غصے سے پھٹ پڑی۔ 'میرے یہ ہاتھ سسرال والوں کی چاکری کے لئے نہیں بنے ہیں، میں ہرگز نہیں رہوں گی وہاں، دیکھ لینا!'

صوفیہ کے یہ جملے سنتے ہی مجھے محسوس ہوا میں، اپنے آپ میں نہیں ہوں۔

'آخر دیکھ لیا نا!' صوفیہ کے اس جملے نے مجھے پھر حقیقت کی دنیا میں لوٹا دیا۔

Farzana Asad
30-Gulistan Colony
Near Pandey Amrai Lans
Nagpur-440013 (M.S)

فرہنگِ آصفیہ سے

ابنِ مریم۔ ف۔ اسم مذکر۔ لقب حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ کیونکہ آپ کو حضرت مریم کے بطن سے خدا تعالیٰ نے بذریعہ روح القدس پیدا کیا تھا اور آپ کو یہ معجزہ دیا تھا کہ آپ بیماروں اندھوں اور مردہ آدمیوں کو تندرست و زندہ کر دیتے تھے چنانچہ حضرت غالب نے شعر ذیل میں اس امر کا اشارہ کیا ہے

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی (غالب)

ابُوالحسن۔ ع۔ اسم مذکر۔ اہلِ اسلام کے ایک نامور حکیم کا نام جس نے علم ہندسہ اور علم ہیئت میں نہایت ہی مہارت حاصل کی تھی۔ عمر خیام اسی حکیم کے شاگردوں میں سے ہے جس کی رباعیاں مشہور اور قابلِ قدر ہیں۔ اس نے آیاتِ متعلقہ ہیئت کی خوب تفسیر لکھی ہے۔

ابُوالفضل۔ ع۔ اسم مذکر۔ جلال الدین اکبر کے وزیر۔ فیضی کے بھائی شیخ مبارک کے بیٹے کا نام جو جہانگیر کے اشارہ سے نرسنگھ دیو کے ہاتھوں ۔۔۔ھ میں قتل کیا گیا۔ بڑا بھاری فاضل اور لائق آدمی گزرا ہے۔ اکبر نامہ۔ آئین اکبری۔ انشائے ابوالفضل وغیرہ اس کی اکثر کتابیں ہیں۔ مذہب فلسفانہ رکھتا اور دہریہ کہلاتا تھا۔

ابُوالنصر فارابی۔ ع۔ اسم مذکر۔ اس حکیم کا نام ابنِ محمد ہے۔ مولد شہر فاراب۔ اپنے وقت کا ارسطو تھا۔ شیخ کامل بھی اس کا لقب ہے اور معلم ثانی بھی اسی کو کہتے ہیں۔ ارسطو کے بعد جسے معلم اول کہتے ہیں اہلِ اسلام کے نزدیک اسی کا درجہ ہے۔ بوعلی سینا۔ کی پیدائش سے تیس برس پیشتر یہ رحلت کر چکا تھا۔ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ شیخ الرئیس فارابی کا شاگرد ہے مگر سرتاسر غلط ہے البتہ فارابی کی تصانیف نے اس کو بہت مدد دی اس حکیم نے ۔۔۔ اور بعض کے نزدیک ۔۔۔ میں رحلت کی۔ یہ ایک امیر لشکر کا بیٹا اور دنیاداروں سے از حد متنفر تھا۔ مدتوں شام میں برسوں بغداد میں رہا۔ سیف الدولہ ابنِ ہمدان نے بیشک حکمت عملی سے اسے یار بنا لیا تھا۔ لیکن باجود تقاضا اس نے اس کے زر و مال سے فائدہ نہ اٹھایا۔ صرف چار درہم روز لیکر یاروں کو کھلا پلا دیا کرتا تھا۔ اس نے ایک ساز بھی بنایا تھا جس کی حکایت طویل ہے۔ ابن عبادہ تمام عمر اس کا مشتاق رہا اور جب وہ ایک مرقع حالت خراب میں آیا تو پہچانا نہیں گیا۔

اگھوری۔ ھ۔ اسم مذکر (۱) ہندو فقیروں کے ایک فرقہ کا نام ہے جو صرف شیوجی کو مانتے اور ہر ایک چیز یعنی نجاست تک کو کھا لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی چیز ناپاک نہیں ہے (۲۔ صفت) غلیظ۔ پلید۔ ناپاک گندہ نجس۔ میلا کچیلا۔ کثیف۔ گھوری۔ بلانوش۔ بلا چٹ۔ (ہندو ع)

ہتھیلیوں کی زبان

فردوس حیدر

ٹرین ایک جھٹکے سے رکی تھی یا الٹ گئی تھی۔ وہ خود کسی سے ٹکرائی تھی یا قلابازیاں کھاتے ہوئے گری تھی، اسے کچھ یاد نہ تھا۔ سب کچھ آن ہی آن میں ہوا تھا۔ بس یوں لگا تھا جیسے ایک لمحہ اس کی گرفت سے پھسل گیا ہو۔ وہ حسین لمحہ جس کے حصول میں اس نے اپنی زندگی داؤ پہ لگا دی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

'شاید وہ وقت آ گیا ہے' اس نے سوچا 'میرے اعضا میرے خلاف گواہی دیں گے' اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھوا پھر اپنے بازو ٹٹولے اور اپنے جسم کے ہر حصے پہ اپنی انگلیاں پھیریں۔ سب کچھ اپنی جگہ پر موجود تھا، محفوظ تھا۔ کچھ بھی نہ بگڑا تھا۔ کچھ بھی نہ ٹوٹا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ دور تک بے بس، لاچار، زخمی کراہتے ہوئے چہروں کی کھیتیاں...... کئی روتی سسکتی ہوئی آنکھیں بہ یک وقت اس کے بدن کو ٹٹولنے لگیں جیسے بے پناہ چیونٹیوں کا ہجوم۔ رینگتی ہوئی چیونٹیوں کے تکلیف دہ احساس سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ بے اختیار اٹھ کے بیٹھ گئی۔

'میں کہاں ہوں؟' اس تمام صورت حال کو سمجھنے کے لیے اس نے مدد مانگی۔ خوف زدہ روتی سسکتی آنکھیں اسی طرح گھورتی ہیں۔ رینگتی چیونٹیوں کا احساس اسی طرح اذیت دیتا رہا۔ لمحے صدیوں کے دائرے بناتے رہے اور اس کا سر چکراتا رہا — تب ایک بوڑھا اس کے قریب آیا 'کسی نے ریل کی پٹری اکھاڑ دی ہے' اس نے اطلاع دی 'دو مردانہ ڈبے الٹ گئے ہیں' اسے یاد آیا وہ ریل پر سوار ہوئی تھی، نئی منزل کی تلاش میں، نئے ہمسفر کے ساتھ...... اسے بہت کچھ یاد آنے لگا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ 'بیٹی اپنے ہمسفر کا نام بتاؤ تاکہ اسے تلاش کیا جائے۔' بوڑھے کے سوال پر وہ مزید پریشان ہو گئی۔ 'میرا ہمسفر کون تھا؟' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ گل کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ گھر سے نکلنے اور ٹرین میں بیٹھنے تک تو وہی میرا ہمسفر تھا لیکن اب اگر وہ زندوں میں نہیں تو میں کیوں کر اس کے حوالے سے اپنی شناخت چاہوں گی؟ یہ عجیب سوال تھا۔ جیسے سانپ پھن پھیلائے اس کے سامنے ہو اور وہ اس زد میں ہو 'شناخت' اس نے سوچا: انسانی زندگی کا ہر مسئلہ اسی شناخت کے گرد گھومتا ہے اور یوں اپنے ہونے اور نہ ہونے کی گتھی سلجھانے میں الجھ کے رہ جاتا ہے میں بھی الجھی ہوئی ڈور ہوں، جس کا کوئی سرا میرے ہاتھ میں نہیں رہا اور اسی سرے کی تلاش میں اپنے پیچھے میں سب در بند کر چکی ہوں اور یہ طے کر چکی ہوں کہ سلامت کے حوالے سے اپنی شناخت نہ چاہوں گی — 'بیٹی گل تمہارا کیا لگتا ہے۔' بوڑھے نے ایک بار پھر پوچھا۔ 'تم نیم بے ہوشی کے عالم میں بار بار یہی نام لے رہی تھیں۔ رضا کاروں کی ٹولی فہرست تیار کر رہی تھی میں نے یہی نام لکھا دیا ہے۔' وہ خوف زدہ دیکھتی رہی جیسے پھن پھیلائے سانپ سے بچنے کی کوئی صورت نہ رہی ہو۔ 'گل اگر زندوں میں نہیں تو میں اس کی ہم سفر کہلاؤں گی۔ جب سلامت اخبار میں ہم دونوں کی تصویر دیکھے گا تو مجھے ہمیشہ کے لیے دھتکار دے گا — ' وہ دھتکارے جانے کے لیے تیار نہ تھی اس لیے خاموش رہی اور گل کی زندگی کی دعائیں مانگنے لگی — معاً گل کی آواز آئی جو اسے پکارتا ہوا، بے بس چہروں کی کھیتیاں الانگتا ہوا اس کی

جانب بڑھ رہا تھا۔

'میرا گاؤں یہاں سے بہت قریب ہے آؤ پیدل چلیں' گل کے الفاظ اس کے لیے مسرتوں کے چراغ تھے۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب اس کی منزل دور نہیں۔ گل کی رفاقت نے اسے حوصلہ دیا اور وہ قدم قدم گاؤں کی جانب بڑھنے لگی۔۔۔

'گاؤں کا ہر رنگ اصلی ہوگا' اس نے سوچا۔ راتیں تاریک اور دن روشن ہوں گے۔ میں شہر کی جاگتی راتوں اور دبیز پردوں میں لپٹے نیم تاریک دنوں سے اکتا چکی ہوں۔ وہ گاؤں کی دھول اڑاتی کچی سڑک پہ یوں چل رہی تھیں جیسے چاند پہ پہنچ گئی ہو۔ وہ بھربھری مٹی پہ قدم جماتی تو مٹی اس کے تلوؤں کے نیچے مسکنے لگتی۔ وہ خوش تھی بہت خوش پھر بھی خیالات امنڈتے آرہے تھے۔۔۔ رات بیت رہی ہے اور میں اپنے شوہر سے بہت دور نکل آئی ہوں۔ اب اگر سلامت چاہے بھی تو مجھے تلاش نہیں کر سکتا۔ کون جانے وہ مجھے تلاش کرنا بھی چاہے گا یا نہیں؟ وہ گل کا ہاتھ تھامے اپنے شوہر سے دور جا رہی تھی پھر بھی اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی اور تذبذب میں مبتلا تھی کہ جو کچھ اس نے کیا ہے ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ اپنے فیصلے کی حمایت میں غور کرنا چاہا تو اپنے گھر کا وسیع ڈرائنگ روم اس کی نظروں کے سامنے تھا۔۔۔

سلامت معمول کے مطابق اپنے دوستوں کے ساتھ گھر آئے گا۔ برف، بوتل اور گلاس اس وسطی میز پہ رکھے ملیں گے۔ ملازم گرم پکوڑے اور چپس تیار کر کے لائے گا اور رحمان گندے لطیفے سنا کر ہنساتا رہے گا۔ پھر میز پر کھانا لگ جائے گا۔ نوکر حسب معمول میرے بیڈ روم کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ کھانا لگنے کا اعلان کرے اور جواب نہ پا کر لوٹ جائے گا۔ سلامت سمجھے گا میں سو چکی ہوں لہٰذا وہ سب میرے بغیر کھانا کھا لیں گے۔ یوں میری عدم موجودگی کا کسی کو علم بھی نہ ہوگا اور رات بیت جائے گی۔۔ اگلے دن سلامت اپنے بیڈ روم میں ناشتہ کر کے ملازم کو دن بھر کے خرچے کی رقم دے گا اور دفتر چلا جائے گا۔ میری غیر حاضری محسوس نہ کی جائے گی سلامت ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دیتا۔ اس کی نظروں میں عورت کی اہمیت دولت پہ بھنبھناتی مکھی سے زیادہ نہیں۔ لیکن اب وہ جان جائے گا کہ اس کی اپنی عورت۔۔۔ اس کی بیوی دولت چھوڑ کے جا چکی ہے اور وہ یہ بھی جان لے گا کہ عورت کو دولت سے زیادہ محبت اور رفاقت کی تمنا رہتی ہے۔

رفاقت کے خیال سے ہی اسے طمانیت محسوس ہوئی اور اسے اپنے فیصلے کے حق میں پورا جواز مل گیا۔ سلامت کے گھر میں رفاقت نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ دونوں ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ دونوں کے بیڈ روم الگ الگ تھے۔ سلامت کی اجازت کے بغیر اس کا خلوت گاہ میں داخلہ ممنوع تھا وہ اس کی شریک حیات کہلاتی تھی لیکن اس کی زندگی کے کسی بھی شعبے میں شریک نہ تھی۔ وہ اپنے مرد کی خلوت اور جلوت میں ہر لمحہ شرکت چاہتی تھی۔ تخلص کی مانند اٹوٹ اور اہم۔ لیکن وہ کسی اور مٹی کا بنا ہوا تھا وہ چاہت اور رفاقت نام کے ہر بندھن سے آزاد رہنا چاہتا تھا اور ان رشتوں کو بے معنی سمجھتا تھا جو اسے پابندیوں میں سانس لینے کی ہدایت دیں یا مجبور کریں۔

'جب ٹرین پٹری سے اتری تو میں نے صرف تمہاری زندگی کے لیے دعا مانگی' گل کہہ رہا تھا 'اپنی جان کی بازی لگا کر تمہیں بچانے کی کوشش کرتا کیونکہ تم نے ایک بار بچپن میں میری جان بچائی تھی۔'

اسے اپنے بچپن کا کوئی ایسا واقعہ یاد نہ تھا۔۔۔

'اس زمانے میں ہم تمہارے سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے۔ میرے بابا تمہارے ہاں چوکیدار تھے۔'

اسے یاد آیا سرونٹ کوارٹر میں رمضانی بابا کے ساتھ ایک گل گوتھنا سا لڑکا بھی تھا۔ وہ سب ہر شام زمین پہ پھسکڑا مار کے مٹی کے پیالوں میں چائے پیا کرتے تھے۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ وہ ہر شام ڈیڈی کے کلب جانے کا انتظار کرتی۔ ان کا قدم گھر سے باہر نکلتا اور وہ سیدھی رمضانی بابا کے کوارٹر میں پہنچ جاتی۔۔۔

'ایک مرتبہ میں تمہیں کمپنی باغ کی سیر کرانے لے گیا تھا۔ تمہاری فرمائش پر میں نے ڈھیروں کیریاں توڑیں اور طوطے کے بچے پکڑے تھے۔ اس دن تم بہت خوش تھیں اور میں نے عہد کیا تھا کہ تمہیں اسی طرح خوش رکھا کروں گا کہ اچانک وہاں تمہارے ڈیڈی آگئے۔ مجھے درخت پر الٹا لٹکا دیا اور تمہیں اپنے ساتھ لے گئے۔'

اسے یہ تمام تفصیل یاد نہ آئی۔۔۔

'میں درخت پہ الٹا لٹکا رہا۔ روتا رہا۔۔۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے اعضا ڈھیلے پڑنے لگے ہیں اور میری بینائی زائل ہونے لگی ہے۔' گل کی آواز کپکپائی 'میں نے گڑگڑا کے خدا کو پکارا۔ تب مدد کا فرشتہ آیا تمہارے روپ میں۔ جب میری آنکھ کھلی تو میرا سر بابا کی گود میں تھا اور تم میرے قریب کھڑی تھیں۔ بابا نے مجھے تم سے دور گاؤں بھیجنے کا فیصلہ کر لیا مگر میرا فیصلہ تمہاری قربت حاصل کرنا تھا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں تمہاری وجہ سے ہوں۔'

اسے کچھ بھی یاد نہ آیا۔۔۔

وہ تو صرف اس قدر جانتی تھی کہ اسے تنہائی کے پیڑ پہ الٹا لٹکا دیا گیا

تھا اور وہ کسی ناکردہ گناہ کی سزا میں دن کاٹ رہی تھی۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ اس کی سزا کتنے دن۔ کتنے ماہ یا کتنے برسوں کی ہے۔ وہ مایوس ہوچکی تھی کہ مدد کا فرشتہ آیا گل کے روپ میں۔

'میں رمضانی چوکیدار کا بیٹا ہوں اور اب سلامت صاحب کا پی۔اے ہوں۔'

ماضی کی یاد کے تارے جلنے بجھنے لگے۔ وہ مسکرائی پھر ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ روتی چلی گئی۔

'تم ہنسنے اور رونے کا سبب جاننا چاہتے ہونا؟' اس نے پوچھا 'ہنسی اس لیے تھی کہ ایک عرصے کے بعد کوئی اپنا نظر آیا ہے۔۔ روتی اس لیے ہوں کہ تم سے ملنے پر پابندی عائد کردی جائے گی۔ بچپن میں جب بھی ڈیڈی کی پابندیوں سے گھبرا کر رمضانی بابا کی جانب بھاگتی تو میرے لیے سرونٹ کوارٹر کی جانب دیکھنا بھی ممنوع قرار پاتا۔ اور اب سلامت کے اشاروں کی پابند ہوں۔ میں جب بھی سونے کے پنجرے میں قید تھی اور اب بھی ہوں۔ سزا میں کوئی فرق نہیں آیا صرف پنجرے بدل گئے' وہ مسکرایا پھر دھیرج سے بولا 'فکر مت کرو اب میں آگیا ہوں' نہ جانے وہ کس کھونٹ سے آیا تھا۔ وہ صرف اس قدر جانتی تھی اس کی صدا کانوں کو بھلی لگتی ہے اور یہ وہ صدا ہے جو پابند لمحوں کی زنجیریں توڑ سکتی ہے۔

اس دن جب سلامت اپنے دوستوں کے ساتھ گھر سے نکلا تو وہ سمجھ گئی کہ جن شکار پہ گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ واپس آکر آدم بو کے نعرے لگائے اور اسے اذیت دینے کے نئے بہانے تلاش کرے اسے کسی ایک کھونٹ روانہ ہوجانا چاہیے۔ وہ جو تنہائی کے پیڑ پہ الٹی لٹکادی گئی تھی اور وہ جس کی نجات کے لیے مدد کا فرشتہ آیا تھا۔ گل کے روپ میں۔ اور وہ جسے موسموں کی شدت بن کے چاہنے اور چاہے جانے کی تمنا تھی۔ اب اپنی سزا کاٹ چکی تھی اور پابند لمحوں کی زنجیریں توڑ چکی تھی۔

اس نے گھر سے باہر قدم رکھتے ہی دروازہ بھیڑ دیا۔ اب وہ چاہتی بھی تو دروازہ نہ کھلتا۔ خودکار تالا اسے گھر سے باہر رکھنے میں معاون ثابت ہوا۔ اسے یاد آیا کہ سلامت اس تالے کی تین چابیاں لایا تھا۔ ایک اپنے پاس رکھی تھی۔ دوسری نوکر کو دی تھی اور تیسری اس کے پرس میں ڈالتے ہوئے کہا تھا 'کبھی غلطی سے باہر لاک ہوجاؤ تو اندر آنے کے لیے استعمال کرلینا'۔۔۔ اس سے ایسی غلطی کبھی نہ ہوئی تھی اور آج جو کچھ بھی ہوا تھا اس کی اپنی مرضی سے ہوا تھا۔ اگر وہ چاہتی تو پرس میں ہاتھ ڈال کر چابی تلاش کرسکتی تھی لیکن اس نے اپنے اندر کی عورت کو سمجھایا کہ چابی تلاش نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ ہوسکتا ہے چابی ملنے پر ایک بار پھر اندر جانے کی خواہش بیدار ہو جائے اور وہ لمحہ جس میں وہ زندگی کا اہم ترین فیصلہ کرنے پر قادر ہوچکی ہے اس کی گرفت سے پھسل جائے۔ لہٰذا اس نے پرس میں ہاتھ ڈال کے نہ تو چابی ٹٹولی اور نہ ہی پیچھے مڑ کے بند دروازے پر نگاہ ڈالی بلکہ سامنے دیکھتی ہوئی گل کی رفاقت کے سحر میں گھر سے دور ہوتی گئی۔۔۔

وہ گل کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اور راستے کی طویل مسافت سے چنداں خائف نہ تھی کہ گل اس کے ہمراہ تھا۔ اس کا اپنا تھا اور اس کا نجات دہندہ تھا۔ اس نے طے کرلیا کہ گاؤں پہنچتے ہی سلامت سے طلاق کا اعلان کردے گی اور گل کے لیے مسرتوں، چاہتوں اور نوازشوں کے در وا کردے گی۔ عین اس وقت گل نے ایک مٹی کے صاف ستھرے گھر کی جانب اشارہ کیا تو اس کا سر خودبخود گل کے کندھوں پر ٹک گیا اور آنکھیں بند ہوگئیں۔ جیسے تمام تھکن اور پریشانی منزل کا نشان پاتے ہی غائب ہوگئی ہو۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک بان کی کھڑی اور تنگی چارپائی پہ تھی۔ وہ ابھی تو اس کے پاؤں گوبر ملی مٹی کے تازہ لیپ سے سن گئے کمرے میں کچی مٹی اور تازی ملے گوبر کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ جو کچھ بھی تھا یہ اس کا خواب محل تھا۔ 'جو کچھ بھی ہے جیسا بھی ہے میرا اپنا ہے' اس نے گوبر کی گھٹی گھٹی گرم مہک کو اپنے اندر بھرتے ہوئے سوچا اور گیلے فرش پہ چلتی ہوئی آنگن میں کھڑی ہوگئی معاً اس نے دیکھا آنگن کے مشرقی گوشے میں ایک عورت میلے کچیلے کپڑوں کی گٹھری بنی ہوئی پٹ رہی ہے۔ گل کے ہاتھوں۔۔۔ وہ دم بخود دیکھتی رہ گئی۔ یہ گل ہی تھا۔ وہ اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ وہ جو پریوں کے دیس سے آیا تھا کوئی اور تھا۔ وہ جو اس کا نجات دہندہ تھا کوئی اور تھا۔ اس وقت اس کے سامنے ایک گنوار دیہاتی تھا جسے وہ بٹر بٹر دیکھ رہی تھی۔ وہ کپڑوں کی میلی گٹھری کو دھنکتے ہوئے دیکھ نہ سکی اور چیخ اٹھی۔ گل کے ہاتھ رک گئے اور اس کی طرف دیکھے بنا پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔۔۔

'غلطی میری تھی' گٹھری عورت بولی 'میں نے کچی آگ پہ چائے کا پانی چڑھا دیا تھا۔ مجھے یاد رکھنا چاہیے کہ دھوئیں پہ بنی چائے بدمزہ ہوتی ہے' پھر ہاتھ بڑھا کر چٹنے سے اپلوں کو اتھل پتھل کرتے ہوئے بولی 'وہ میرا مالک ہے۔ اسے پیٹنے کا حق حاصل ہے۔ میں اس کی زمین ہوں نا؟' عورت کے چہرے پہ تکبر تھا۔ جیسے وہ اپنے آپ کو زمین کہہ کے رتبے والی بن گئی ہو اور احساس دلا رہی ہو تو قیر والیاں عزت و احترام والیاں ایسی ہوتی ہیں۔

'میرا مرد کہیں بھی چلا جائے' عورت کہہ رہی تھی۔ 'میرا ایمان ہے، اس کا میرا رشتہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا کہ زمین اور کسان کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے'۔ وہ کہنا چاہتی تھی اے عورت تو نہایت احمق ہے۔ تجھے پیٹا

جا رہا ہے۔ تیرا استحصال ہو رہا ہے۔ احتجاج کر — احتجاج...... مگر وہ خاموش رہی۔ اس لیے کہ عورت نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا —

'میرا مرد واہڈی کے دنوں میں گاؤں آتا ہے اور بڈل (بادل) دانگوں گرجتا برستا ہے۔ جو مرد اپنی عورت کو گرم ہاتھ نہیں لگاتا تو سمجھو اسے پیار نہیں کرتا۔ وہ جس دن مجھے مارتا ہے اسی رات پیار بھی کرتا ہے۔ ایسا پیار جس میں سورج کی تپش اور چاند کی ٹھنڈک ہے۔'

اسے اب عورت کی باتوں پہ غصہ آ گیا 'نان سینس' وہ چیخی 'کبھی تپش اور خنکی بھی یکجا ہوئے ہیں۔'

عورت کے چہرے پہ طمانیت تھی۔ 'اپنے مالک سے ایسا پیار کرو جو زمین اپنے کسان سے کرتی ہے' اسے جاہل اور گنوار عورت کے پر سکون لہجے پہ حیرت ہوئی۔ وہ رفاقت اور چاہت میں، بلا شرکت غیر جینا چاہتی تھی۔ کل نے اسے کبھی نہیں بتایا کہ گاؤں میں اس کی بیوی ہے جو زمین کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے اور جسے واہڈی کے دنوں میں بادل کی طرح گرجتی برستی محبت کا احساس دلایا جاتا ہے۔ اسے شدت سے سلامت کی یاد آئی اور ہوا تیزی سے کچے مکان کی دہلیز عبور کر کے باہر نکلی۔ وہ اسٹیشن کی جانب بڑھتی ہوئی سوچنے لگی 'پرانے زمانے میں خیمہ اجتماع پر اپنی خطائیں معاف کرائی جاتی تھیں۔ میں بھی سلامت سے کہوں گی مجھے جی بھر کے پیٹو۔ لہولہان کر دو اور میرا خون اپنی عبادت گاہ میں بہا دو۔ مجھ پر گرجو اور برسو کہ میں تمہاری زمین ہوں۔'

وہ دروازہ جو وہ اپنے پیچھے بھیڑ چکی تھی اب بھی اسی طرح بند تھا۔ اس نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کے چابی کو ٹٹولا۔ چابی ملتے ہی آہستہ سے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں اندر داخل ہوئی۔ راہداری میں رک کے ڈرائنگ روم میں جھانکا سب کچھ ویسے ہی تھا۔ حسب معمول سلامت اور اس کے دوست ہاتھوں میں گلاس تھامے بیٹھے تھے۔ وسطی میز پر کھانے کا سامان رکھا تھا اور رحمان کوئی گندہ لطیفہ سنا رہا تھا۔ سب ہنس رہے تھے۔ وہ مجرم بنی ڈرائنگ روم میں جا کھڑی ہوئی۔ قہقہے یک لخت رک گئے۔ سلامت سمیت سب ساتھیوں نے اسے دیکھا۔ وہ سر جھکائے کھڑی رہی جیسے کاہن کے اعلان کی منتظر ہو۔ سلامت اپنی کرسی سے اٹھا اور اس کے قریب آیا۔ وہ تھپڑوں اور گھونسوں کے لیے تیار تھی۔ وہ لہولہان ہونا چاہتی تھی اور اس کے بعد تپش اور خنکی کے امتزاج کو اپنی ذات کا حصہ بنانا چاہتی تھی۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ سلامت نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور نہایت نرم لہجے میں کہا 'سوری ڈارلنگ ہم لوگ شکار کھیلنے دور تک نکل گئے اور کئی دن گھر سے غائب رہے' اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی قربانی رد کر دی گئی ہے اور مقدس آگ سرد پڑ گئی ہے۔ اس نے روتے ہوئے سلامت کی جانب دیکھا مگر سلامت کی نظریں وسطی میز پر رکھی بوتل پہ تھیں۔

'ہم تو آج بھی واپس نہ آتے' رحمان نے کہا 'مگر یسوویل کو اپنی بیوی کی یاد ستانے لگی ہمارا دوست ایک ہفتے سے زیادہ اپنی بیوی سے دور نہیں رہ سکتا' سب نے معنی خیز نظروں سے یسوویل کی جانب دیکھا اور قہقہہ لگایا۔

'ٹھہرو برادر' یسوویل نے دونوں ہاتھ بلند کیے اور کہا 'آسمان کی بادشاہی ان دس کنواریوں کی مانند ہے جو اپنی مشعلیں لیے دولہا کے استقبال کو نکلیں اور تیل اپنے ساتھ نہ لیا۔ مگر چند عقلمندوں نے اپنی کپیوں میں تیل بھی لے لیا۔ جب دولہا نے دیر لگائی اور سب اونگھنے لگیں تو وہ جنھوں نے تیل نہ لیا تھا تیل مول لینے بھاگیں۔ دولہا آ گیا — جو تیار تھیں شادی کے جشن میں شریک ہونے اندر چلی گئیں اور دروازہ بند ہو گیا۔ باقی کنواریاں لوٹیں تو درخواست پر بھی دروازہ نہ کھلا۔'

برادر یسوویل چپ ہوا تو رحمان نے قہقہہ لگایا 'ہمیں اعتراف ہے اس مرتبہ ہم اپنی بیویوں سے زیادہ دن دور رہے۔' اس نے وضاحت کی 'ہماری بیویوں کو دیر سویر کا عادی ہونا چاہیے اور جان لینا چاہیے کہ شکار کا موڈ اچانک بنتا ہے اور دنوں بنا رہتا ہے۔'

'بے شک — بے شک' سب نے تائید کی —

'ہماری کسی بھی عورت کو' سلامت نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے دوسرے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا 'تیل مول لینے بھاگنے کی ضرورت نہیں' —

'بے شک — بے شک' سب نے مسکرا کے کہا —

اس کی آنکھوں سے اسی طرح آنسو رواں تھے اب وہ سسکنے لگی —

'رونا بند کرو' سلامت نے ناگواری سے اس کے کندھے جھٹکے 'میں تو اکثر اطلاع دیے بغیر شکار پہ جاتا ہوں اور دنوں غائب رہتا ہوں۔ کوئی نئی بات نہیں۔'

سب نے کہا 'بے شک کوئی بات نہیں۔' اور اپنے اپنے گلاس منہ کو لگا لیے —

چابی اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ آنسو بھری آنکھوں سے دروازے کے قریب کھڑی ایک ٹک اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ دروازے کے کس جانب کھڑی ہے اور دروازہ اندر سے بند ہے یا باہر سے —

(معرفت محسن خاں، کنول ہار، ملیح آباد، لکھنؤ۔ 227111)

ادا جعفری

بلاوا

وہ جو چپ چاپ بھری بزم سے اٹھ کر چل دیں   یوں دبے پاؤں کہ جیسے کبھی آئیں نہ گئیں
بے نیازی تھی کہ خود داری فن تھی لوگو!   شب کی مہماں کوئی گم گشتہ کرن تھی لوگو!
زہر کا جام بھلا راس کسے آیا ہے
درد کا زہر تھا رگ رگ میں لہو کے بدلے   ناتواں دل کے مگر پھر بھی وہی تیور تھے
اور وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی حیراں آنکھیں   نہ ہراساں نہ پریشاں نہ پشیماں آنکھیں
وہی آسودہ و مانوس تبسم لب پر
زہر کا ناز اٹھایا تو کئی غم بہلے   اتنی تنہائی کہ تنہائی بھی لو دینے لگے
خامشی ایسی کہ ہنگامۂ محشر جیسے   یاد کے دھندلے دریچوں میں کہیں صف آرا
عہد ماضی کے حسین خواب تمنا کے سراغ   دور افق پار فروزاں کسی فردا کے چراغ
درد کی شب کو اجالوں کے سندیسے بھیجے   چند روز اور امیدوں کے سہارے کٹتے
زندگی کو کئی راہوں سے گزرتے دیکھا   فکر انساں کی صداقت کو نہ مرتے دیکھا
موت پہلے بھی تو ان جیسوں کا مقصود نہ تھی   جانے کس دیس پہنچنے کی ہوئی تھی جلدی
جانے کس بزم سے آیا تھا بلاوا اب کے؟

رخسانہ جبیں

غزل

اک عمر سے جاری ہے لہو دیدۂ تر سے
اس دشتِ تپاں پر کبھی بادل نہیں برسے

دلوں نے خفا ہو کے جسے چھوڑ دیا تھا
گزرا ہی نہیں کوئی پھر اس راہ گزر سے

اس کو بھی مہک لمس کی کرتی ہے پریشاں
کچھ میرے لہو میں بھی اڑاتی ہے شرر سے

ہر صبح مرے شہر میں بکھرا کے اُجالا
ہر شام چلا جاتا ہے وہ جانے کدھر سے

آنکھوں نے سنائی ہے وہ بے لفظ کہانی
ہم مہر بہ لب لوٹے تھے لذت کے سفر سے

صبا عزیز

غزل

گھر کے دیوار و در دیکھتے رہ گئے
ہم تری رہ گزر دیکھتے رہ گئے

کیا خزاں یہ تری مہربانی نہیں
بے ردا ہر شجر دیکھتے رہ گئے

جب سرِ شاخِ مشرق سے چمکی کرن
ہم نمودِ سحر دیکھتے رہ گئے

رات کا کرب لوگوں نے پوچھا نہیں
رقصِ شبنم شرر دیکھتے رہ گئے

وہ سنا بھی گیا اپنی روداد غم
ہم ادھر اور ادھر دیکھتے رہ گئے

شہر میں ٹوٹا جس وقت قہر خدا
لوگ اپنا ہی گھر دیکھتے رہ گئے

اے غزل کس کے سرتاج رکھتے ترا
ہم زوالِ ہنر دیکھتے رہ گئے

وقت نے جس کا ہر نقش دھندلا کیا
ہم صبا وہ نگر دیکھتے رہ گئے

Saba Azeez
B1/104
Punjabi Saudagar Apartment
Mayur Vihar Ext-I
New Delhi-110091

غزلیں

سنیتا رینا

پھولوں کے کھلنے پر بھی اپنی آنکھ بھر آئی نہیں
شاید کہ زخموں میں ابھی اتنی بھی گہرائی نہیں

پھولوں کے ہنسنے پر نظر کیوں مری مسکائی نہیں
شاید کہ جینے کی ہمیں تہذیب ہی آئی نہیں

ہم جی رہے ہیں پھر بھی اس کو زندگی کیسے کہیں
ہو زندگی سے وصل کیا جب ہم کو راس آئی نہیں

ہم نے بہاروں کے لیے آنکھیں بچھائی کس لیے
شاید خوشی اس نے میری خاطر بنائی ہی نہیں

ہم کو اسی کے ساتھ ہر رشتہ نبھانا ہے بھلے
یہ زندگی اپنی نہیں اتنی پرائی بھی نہیں

یہ زندگی کی قید بھی کتنی انوکھی قید ہے
جس میں سلاخیں بھی نہیں لیکن رہائی بھی نہیں

رینا ہمیں اپنے غموں کے ساتھ جینا ہے ابھی
اس میں اگر نیکی نہیں کوئی برائی بھی نہیں

زمیں عجیب اور آسماں عجیب لگتا ہے
کہ شہر کا ہر اک مکاں عجیب لگتا ہے

جمیل ہے، حسین ہے، جہاں یہ سچ سچ
مگر مجھے یہی جہاں عجیب لگتا ہے

خبر تو ہے کہ زندگی کا ہے یہی حصول
مگر مجھے تو یہ گماں عجیب لگتا ہے

ہے کس کی دین آدمی کو فتنے اور فساد
یہ امن کیا یہ کیا اماں عجیب لگتا ہے

کسی سوال کا نہیں ہے ہم کو کوئی ڈر
مگر یہ روز امتحاں عجیب لگتا ہے

Suneeta Raina
C1-606 Summer Palms
Sector-86, Faridabad-121002 (Haryana)

موسم گرما اور مشروبات

اسماء انصاری

موسم گرما کی آمد کے ساتھ ہی بے اختیار ٹھنڈی ٹھنڈی چیزیں کھانے پینے کو دل چاہتا ہے۔ بالخصوص لسی، آئس کریم، برف کا گولہ، ٹھمس اپ، پیپسی اور اسپرائٹ وغیرہ۔ زیادہ تر لوگ موسم گرما میں سوفٹ ڈرنکس کو پسند کرتے ہیں کیونکہ ان مشروبات کے استعمال سے فوری طور پر انسان اپنے اندر شادابی اور تروتازگی محسوس کرتا ہے حالانکہ یہ کیفیت قلیل مدت تک ہی رہتی ہے۔ سوفٹ ڈرنکس کے لمبے عرصے تک استعمال سے ہماری صحت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو ہمارے لئے بے حد نقصان دہ ثابت ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ ان مشروبات میں شکر و الکوحل کی مقدار زیادہ ہوتی ہے جس کی بناء پر مختلف مہلک بیماریاں جنم لیتی ہیں مثلاً موٹاپا، ہائپرٹینشن، ہائی بلڈ پریشر، ذیابیطس، Gastrointestinal آنت اور معدے سے متعلق بیماریاں قابل ذکر ہیں۔

موسم گرما شروع ہو چکا ہے چلچلاتی دھوپ اور گرم ہوائیں ہماری طبیعت اور ہمارے جسم پر خاصی اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہر موسم ہمارے جسم پر خوشگوار اثر ڈالتا ہے مگر اسی کے ساتھ کچھ امراض بھی سر ابھارتے ہیں۔ موسم گرما میں پسینہ کے زیادہ اخراج ہونے سے ہمارے جسم میں پانی کی کمی واقع ہونے سے عضلات میں تشنج پیدا ہونے کے مواقع زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ گرمی میں لو لگنے کا بھی ڈر ہوتا ہے۔ الجھن، گھبراہٹ، پیشاب کی جلن، پیشاب میں خون آنا، پت اچھلنا، نکسیر پھوٹنا، خارش، گھمبی، پیچش، اسہال، ہچکی لگنا، بلڈ پریشر، دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونا اور بدہضمی وغیرہ موسم گرما کے عام مسائل ہیں جو ہر دوسرے فرد کو درپیش ہوتے ہیں لہذا گرمی میں پانی زیادہ مقدار میں استعمال کرنا چاہیے اور اگر اسی کے ساتھ ٹھنڈی تاثیر رکھنے والے قدرتی پھلوں سے بنائے گئے مشروبات ہو تو سونے پہ سہاگہ ہے۔ قدرتی پھلوں سے بنائے گئے مشروبات فرحت بخش اور راحت جاں ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری صحت کا بھی خیال رکھتے ہیں اور موسم گرما میں ہمارے جگر اور معدے کو تقویت فراہم کرتے ہیں۔ میٹھے مشروبات سے توانائی و فرحت حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ کھٹے مشروبات سے مختلف امراض کا ازالہ ہوتا ہے۔ لہذا اسی خیال کے تحت ہم آپ کے لئے کچھ مشروبات کا ذکر کر رہے ہیں جو سستے اور جھٹ پٹ بننے والے ہیں بلکہ جاں افزاں ہونے کے ساتھ فوائد میں بھی بہتر ہیں۔

1) شربت کوکم:

کوکم میں ایسی ٹک ایسڈ (Acetic acid) اسکوربک ایسڈ (AscorbicAcid) ہائیڈرو آکسی سائٹرک ایسڈ (Hydroxycitric Acid) ڈمالک ایسڈ (Dmalic Acid) اور Garcinol کی کثیر مقدار پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ پالی فینالس (Polyphenols) بھی پائے جاتے ہیں۔ گرمی میں شربت کوکم، ریاح خارج کرتا ہے، بدہضمی دور کرتا ہے، بھوک لگاتا ہے، وزن کم کرتا ہے، کولیسٹرول کم کرتا ہے، گھمبی، پت اچھلنے سے بچاتا ہے، جسم کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے، لو لگنے سے بچاتا ہے۔

2) شربت کیری / آم:

کچے آم میں Quercetin اور Astragalin نامی اینٹی آکسیڈنٹ پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں prebiotic بھی پائے جاتے ہیں۔

مقوی بدن، جراثیم کش، morning sickness اور امراض گردہ کے لئے مفید ہے۔

3) شربت لیموں:

قدرت نے لیموں کو وافر غذائی اجزا سے سرفراز کیا ہے۔ اس میں پچاس فیصد تو پانی ہے اس کے علاوہ خون کی صفائی کے لیے بھی مفید ہے۔ متلی اور قے میں نمک کے ساتھ فائدہ مند ہے۔ ہاضم ہے، بھوک بڑھاتا

ہے،جسم کی بڑھی ہوئی حرارت کو کم کرتا ہے،جلد کے امراض پھوڑے پھنسی اور خارش میں بھی مفید ہے،نکسیر پھوٹنا، الجھن، گھبراہٹ کو کم کرتا ہے۔

4) شربت بیل:

پیچش اسہال میں فائدہ مند ہے، دل کو تقویت دیتا ہے جریان خون کو روکتا ہے۔

5) شربت خس:

الجھن گھبراہٹ کو کم کرتا ہے جسم کو تروتازہ رکھتا ہے دماغ کو سکون دیتا ہے نیند لاتا ہے۔

6) شربت فالسہ:

کھٹا میٹھا فالسہ خواتین اور بچوں میں زیادہ پسند کیا جاتا ہے اس کا مزاج سرد ہے فالسہ دل جگر اور معدے کو طاقت دیتا ہے جسم کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے متلی، قئے، نکسیر پھوٹنا، اسہال، پیشاب کی جلن، پیشاب تکلیف سے اترنا، پت اچھلنا وغیرہ شکایتوں میں مفید ہے۔ پیاس کو تسکین دیتا ہے اور گھبراہٹ کو دور کرتا ہے۔ فالسہ صفراوی شوگر کے مریضوں کے لئے اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

7) شربت گلاب:

الجھن گھبراہٹ دور کرتا فرحت بخش ہے دماغ کو سکون دیتا ہے دل کی دھڑکن کو کنٹرول کرتا ہے مرض گردہ میں مفید ہے۔

8) چھاچھ اور لسی:

اس میں لیکٹک ایسڈ کی وافر مقدار ہوتی ہے جو ہضمہ میں مفید معاون ہوتا ہے اس کے علاوہ اس میں pribiotics pribiotics کی بھی کثیر مقدار پائی جاتی ہے جو جسم کے نارمل فلورا کو صحت مند رکھتے ہیں۔ حرارت کو تسکین دیتا ہے، پیشاب آور ہے۔ پیشاب کی جلن، معدہ اور آنتوں کو تقویت دیتا ہے اور لو لگنے میں بھی مفید ہے۔

9) شربت الائچی:

گرمیوں میں شربت الائچی پسینے کی بدبو سے نجات دلاتا ہے سر درد اور مرگی سے نجات دلاتی ہے متلی، قئے، ابکائی اور اسہال کو روکتی ہے ہاضمہ کی قوت مین اضافہ کرتی ہے۔ الائچی کو عرق گلاب مین رات بھر بھگو کے صبح ہلکا جوش دے کر بطریق عام شربت تیار کریں۔

10) شربت انار:

مزاج کے حوالے سے انار سرد تر ہے اس میں ہیموگلوبین کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شفاف خون بہت زیادہ پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ گرمی کی شدت سے پیدا ہونے والی پیاس میں راحت دیتا ہے گھبراہٹ اور بے چینی کو ختم کرتا ہے۔

11) شربت پودینہ:

پودینہ کھانے کو زود ہضم بنانے کے ساتھ ساتھ معدہ کو ٹھیک کرتا ہے۔ پودینہ بھوک بڑھاتا ہے، عمل انہضام کے امراض، جگر کے امراض، قئے، اسہال جیسی بیماریوں میں اس کا استعمال فائدہ مند ہے۔ اور تمام جلدی بیماریاں مثلاً خارش، چہرے کے کیل مہاسے ختم ہوجاتے ہیں۔

12) شربت تربوز:

تربوز ایک جادوئی پھل ہے جو بلڈ پریشر، دل کے امراض سے بچانے کے ساتھ ساتھ وزن بھی کم کرتا ہے۔ تربوز میں پانی کی غیر معمولی مقدار جسم میں پانی کی کمی کو پورا کرتی ہے۔ اس میں موجود امائنو ایسڈ صحت پر بہت مثبت طور پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

13) شربت خربوزہ:

تربوز کی طرح یہ بھی پانی کی وافر جز و رکھنے والا پھل ہے۔ تاثیر میں سرد ہے، پیشاب آور ہے، قبض کھولنے والا، خون بنانے والا اور جسم کا درجہ حرارت کنٹرول کرنے کی صلاحیت رکھنے والا پھل ہے۔

14) سنترہ:

سنترہ بڑا مفید پھل اور مناسب غذا ہے خون کو صاف کرتا ہے پیشاب آور پیاس بجھاتا ہے جگر اور معدہ کی سوزش میں فائدہ مند ہے۔

15) اسٹرابیری:

اسٹرابیری میں پوٹاشیم اور میگنیشیم دونوں بڑی مقدار میں پائے جاتے ہین اور ہائی بلڈ پریشر کو کم کرنے میں موثر ثابت ہوتے ہیں۔ اسٹرابیری ہائپر ٹینشن کو کم اور میٹابولزم کو تیز کرتی ہے اور بھوک کو کم کرنے میں مددگار ہے۔

مندرجہ بالا مشروبات آپ کو تروتازہ رکھتے ہیں یہ نا صرف خوش ذائقہ ہوتے ہیں بلکہ ہماری صحت پر بھی انتہائی مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔ کیمیکل اور مصنوعی ذائقوں سے بنے مشروبات سے بہتر ہے کہ ان صحت بخش مشروبات کو موسم گرما مین استعمال کریں اور مہمانوں کی تواضع بھی انہیں مشروبات سے کریں۔ ذائقہ اور لذت سے بھرے مشروبات سے لطف اندوز ہو کر مہمان بھی اپ کی تعریف کئے بنا نہیں رہیں گے۔

Ansari Asma Bano Saleem Akhtar
House No.16 Survey No.374
Madina Park Firdos Nagar
Near Masood Masjid
Dhule 424001(MS)

سید محمد حسان نگرامی

خواتین میں روزمرہ کی بیماریاں اوران کا علاج

عورتوں میں کچھ بیماریاں بہت عام ہیں جو بظاہر چھوٹی دکھتی ہیں لیکن ان تکلیفوں سے خواتین اکثر پریشان رہتی ہیں ہم اس طرح کی روزمرہ کے امراض کا ذکر کر رہے ہیں جو کبھی دوران حمل ہوتی ہیں کبھی وضع حمل کے بعد کبھی ماہواری کے دوران کبھی دودھ پلانے کے زمانہ میں اور کبھی موٹاپے اور جسم کے بھاری ہونے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔

ان سب میں سب سے عام بیماری ضعف دماغ ہے اس مرض میں دماغ کمزور ہو جاتا ہے، چکر آتے ہیں، طبیعت ست رہتی ہے۔ تھوڑا کام کر کے تکان محسوس ہوتا ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے یہ معلوم کریں کہ دماغ کی کمزوری کے ساتھ جسم میں کیلشیم یا ہیموگلوبن کی کمی تو نہیں ہے۔ کیلشیم کی کمی کی سب سے خاص پہچان یہ ہے کہ پیروں میں شدید اینٹھن ہوتی ہے اور ہڈیوں میں کمزوری معلوم ہوتی ہے اس صورت میں درج ذیل دوائیں اغذائیں مفید ثابت ہوتی ہیں۔

1۔ بادام 5 عدد رات میں بھگو کر صبح اس کا چھلکا اتار لیں
2۔ خشخاش سفید 3 گرام
3۔ ادرک 2 گرام کا ٹکڑا
4۔ سفید تل 6 گرام
5۔ مرچ سیاہ دو دانے

بادام کے ساتھ ساری چیزیں دودھ میں پیس لیں اور صبح کو چاٹ لیں، اگر کیلشیم کی کمی ہو تو کیلشیم کی 500 ملی گرام کی گولی روزآنہ کھلائیں خون کی کمی ہو تو آئرن کی ایک گولی دن میں ایک بار کھلائیں۔

دوسری عام تکلیف ہے کمر اور گھٹنوں کا درد یہ تکلیف بے حد عام ہوتی جارہی ہے خاص طور پر خواتین میں جسم بھاری ہو جاتا ہے اور کمر، گھٹنے میں تکلیف ہونے لگتی ہے۔ بعض مریضوں میں یہ تکلیف اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہو جاتا ہے اس کے لئے درج ذیل نسخہ کو دس دن تک استعمال کرانے سے آرام ہو جاتا ہے

1۔ اسگندھ 25 گرام
2۔ ستاور 20 گرام
3۔ موصلی سفید 20 گرام
4۔ سورنجان شیریں 20 گرام
5۔ گوند موچرس 10 گرام
6۔ سونف 15 گرام
7۔ گوند ببول 20 گرام
8۔ مصری 15 گرام (اگر شوگر ہو تو اسے نہ ڈالیں)

ساری دواؤں کا سفوف بنالیں اور 4 گرام صبح شام کھلائیں

اگر وزن زیادہ ہو اور جسم بھاری ہو تو درج ذیل نسخہ مفید پایا گیا ہے

1۔ زیرہ سفید 10 گرام
تخم گزر 10 گرام
بادیان 15 گرام
سورنجان 10 گرام
اسگندھ 15 گرام
پودینہ خشک 5 گرام

ساری دواؤں کا سفوف تیار کرلیں اور 3 گرام صبح شام کھلائیں ساتھ میں دو عدد انجیر سوتے وقت کھلائیں۔

تیسری عام تکلیف ماہواری کے زمانہ میں پیٹ میں درد، الجھن اور چکر جیسی علامت کے ساتھ ملتی ہے اس صورت حال کے لئے یہ نسخہ فائدہ مند ہے۔

1۔ تخم کاسنی 10 گرام
2۔ تخم کو 15 گرام
3۔ صعتر فارسی 10 گرام
4 پودینہ خشک 5 گرام

5۔ تخم گزر 10 گرام
6۔ بادیان 15 گرام
7۔ انیسون 10 گرام

ساری دواؤں کا سفوف بنالیں اور 3 گرام صبح شام کم از کم دس دن تک کھلائیں حسب ضرورت اسے مزید ایک ہفتہ تک اور کھایا جاسکتا ہے۔

چوتھی اہم تکلیف جی متلانا، ریاحیں بننا، تھوڑا سا کھانے سے پیٹ بھرا بھرا لگنا۔ ان علامات کے لئے درج ذیل دو دواؤں کا سفوف فائدہ مند پایا گیا ہے۔

1۔ اناردانہ شیریں 10 گرام
2۔ چھوٹی الائچی کے دانے 5 گرام
3۔ نمک سیاہ 2 گرام
اگر بلڈ پریشر ہو تو اسے شامل نہ کریں
4۔ بڑی الائچی کے دانے 5 گرام
5۔ پودینہ خشک 5 گرام
6۔ اناردانہ ترش 10 گرام
7۔ سونف 15 گرام

ساری دواؤں کا سفوف بنالیں اور 3 گرام سفوف کھانے کے بعد استعمال کرائیں۔

ایک اور تکلیف بھی عام ہے جس میں مریض کا دل دھڑکتا ہے، سانس پھولتی ہے، گھبراہٹ ہوتی ہے نیند کم آتی ہے ایسی تکلیف کے لئے درج ذیل دوائیں مفید پائی گئی ہیں۔

1۔ آبریشم مقرض 10 گرام
2۔ دانہ الائچی خورد 3 گرام
3۔ خشخاش سفید 10 گرام
4۔ سونف 10 گرام
5۔ پودینہ خشک 5 گرام
6۔ آملہ خشک 10 گرام

ساری دواؤں کا سفوف بنالیں اور 3 گرام سفوف صبح شام ایک ہفتہ تک کھلا دیں اس کے لئے جب ضرورت ہو تو ایک خوراک دے دیں۔

ایک اور عام مرض ہے لیکوریا جسے سیلان رحم بھی کہتے ہیں یہ کس قدر مہلک ہے سبھی واقف ہیں اس کے لئے بھی ایک نسخہ پیش ہے۔

1۔ گوند ببول بریاں 10 گرام
2۔ مازو خشک 2 عدد
3۔ اسگندھ 25 گرام
4۔ گوند پاس 10 گرام
5۔ گل پستہ 1 گرام
6۔ گلنار 10 گرام
7۔ کشتہ قلعی 5 گرام
8۔ مصری 50 گرام

ساری دواؤں کا سفوف بنالیں اور 3 گرام صبح کے وقت ایک پیالی دودھ کے ساتھ کھلائیں۔

ان دواؤں کے علاوہ خواتین کے لئے چند مخصوص آسانی سے گھر میں ملنے والی چیزیں بھی برابر استعمال کرنے سے اوپر لکھی ہوئی تکلیفوں سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔

۔ روزآنہ کھیرا کھلائیں
۔ مولی کے ایک دو ٹکڑے لے لیں
۔ گاجر کا کثرت سے استعمال کریں
۔ پپیتہ کھلائیں
۔ ایک سنگترہ روزآنہ کھلائیں۔
۔ قبض کی حالت میں دو عدد انجیر سوتے وقت کھلائیں
۔ معدہ کمزور ہو ہاضمہ جلد خراب ہو، دست آتے ہو تو مربہ بیل کھلائیں
۔ دل گھبراتا ہو تو ایک عدد مربی آملہ روز کھلائیں
۔ ریاحیں زیادہ بنتی ہوں تو ادرک کے باریک ٹکڑے کرکے انھیں خشک کریں اور مرچ سیاہ اور کالا نمک کا سفوف چھڑک کرکے محفوظ کرلیں اور 3-3 ٹکڑے ضرورت کے وقت کھلائیں
۔ نظر کمزور ہو تو سونف ایک چمچ روزآنہ کھلائیں
۔ پیشاب جلد آتا ہو اور شوگر نہ ہو تو ۳ عدد پستہ صبح شام کھلائیں
۔ دماغ کمزور لگے تو ایک عدد اخروٹ کا مغز ۳ بادام تھوڑی سے سونف کے ساتھ کھلائیں
۔ بھوک کی کمی ہو تو پودینہ، پیاز سرکہ میں ملا کر کھلائیں

انشاءاللہ اوپر لکھی ہوئی دواؤں اور غذاؤں کے کھانے سے خواتین کو عام طور سے پیش آنے والی تکالیف ختم ہوجائیں گی۔

Dr. S. M. Hassan
Dr. Hassan Herbal Clinic
Behind Medah Ganj Police Chowki
Sitapur Road, Lucknow-226020 (U.P)

انیمیا: خواتین کا ایک عام مرض

زرین حلیم

ہم سب ہر سال بڑے جوش وخروش کے ساتھ عالمی یوم خواتین مناتے ہیں اور اس موقع پر مختلف تقریبات اور پروگرام میں شرکت کرتے ہیں۔ساری دنیا میں عورتوں کے حقوق اور ان کی خدمات کے حوالے سے گفتگو ہوتی ہے۔خواتین کو مبارکباد دی جاتی ہے۔ان ساری باتوں سے خواتین کو حوصلہ ملتا ہے اور وہ کچھ بہتر کرنے کی کوشش کرتی ہیں،لیکن کچھ دنوں بعد اس مرد اساس معاشرے میں عورت کہیں گم ہو جاتی ہے اور پھر سے عورتوں پر ظلم اور زیادتی کی خبریں ہمارے روزانہ کا معمول بن جاتی ہیں۔عورت کی زندگی اس کے خاندان کے ارد گرد گھومتی رہتی ہے۔اپنے شوہر اور بچوں کی خدمت کرنا اور چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھنا عورت اپنا فرض سمجھتی ہے۔لیکن ان سب کے درمیان وہ خود اپنا وجود کہیں گم کر دیتی ہے۔اور اپنی صحت پر توجہ نہیں دے پاتی ہے۔وقت پر نہ تو کھانا ہوتا ہے اور نہ ہی ناشتہ۔آج اگر ہم عورت کی صحت پر کوئی سروے کریں تو اندازہ ہوگا کہ گھریلو کام کاج کرنے والی زیادہ تر عورتیں مختلف چھوٹی موٹی بیماریوں کا شکار ہیں۔اگر عورت صحت مند ہوگی تو گھر کا نظام بھی درست رہے گا اور عورت اگر بیمار ہے تو پورا گھر اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے محتاج ہو جاتا ہے۔آئیے اب بات کرتے ہیں خواتین کی ایک عام بیماری انیمیا کی۔وقت پر کھانا نہ کھانے سے اور زیادہ کام کرنے سے خواتین میں خون کی کمی واقع ہو جاتی ہے جسے انیمیا کہتے ہیں۔اس مرض میں جسم میں تھکاوٹ کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔بدن میں سوجن بھی ہو جاتی ہے۔ ذرا سا کام کرنے سے سانس پھولنے لگتی ہے۔خاتون کو ہر وقت سستی اور کاہلی کا احساس رہتا ہے۔مزاج میں چڑچڑاپن بھی آجاتا ہے۔رنگت زرد ہو جاتی ہے۔ اس صورتحال سے سارا گھر پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔خاتون کے جسم میں خون کم ہونے کی وجہ سے آکسیجن کی بھی کمی ہو جاتی ہے اور وہ ذہنی تناؤ کا بھی شکار ہو سکتی ہے۔اسے اپنے آس پاس سے دلچسپی ختم ہونے لگتی ہے اور نیند نہ آنے کی شکایات بھی ہو جاتی ہیں۔ان ساری علامات کو دیکھتے ہوئے وقت پر علاج شروع کر دینا چاہئے اور کسی ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے۔وقت پر علاج نہ ہونے کی صورت میں یہ عارضہ خطرناک ہو سکتا ہے اور دل کی بیماری میں مبتلا ہونے کا بھی خدشہ ہے۔

آپ سب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں صحت کا شعبہ بہت بہتر نہیں ہے۔ملک میں اسپتالوں کی کمی بھی ہے اور وقت پر مریض کو طبی امداد بھی نہیں مل پاتی ہیں۔خواتین کے امراض میں بھی دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ایک سروے کے مطابق ہر سال ایک لاکھ خواتین انیمیا کی شکار ہو کر

مرجاتی ہیں۔ ملک میں لاکھوں کی تعداد میں خواتین خون کی کمی کا شکار ہیں۔ انیمیا نے پچھلے کچھ برسوں میں ایک خطرناک صورت اختیار کرلی ہے۔ یہ مرض اب خواتین میں بہت عام ہوگیا ہے کیوں کہ ماہواری کی وجہ سے ان کے جسم میں کافی مقدار میں خون نکل جاتا ہے۔ حمل کے دوران بچہ بھی خاتون کے جسم سے خون لیتا ہے۔ اس وجہ سے بھی جسم میں خون کی کمی ہوجاتی ہے۔ عورتوں اور لڑکیوں پر توجہ بھی کم دی جاتی ہے۔ یہ ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ گھر میں لڑکوں پر زیادہ دھیان دیا جاتا ہے اور لڑکیوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ خود عورتیں بھی گھر میں لائی گئی مقوی اشیا میں گھر کے مردوں کو زیادہ حصہ دے دیتی ہیں اور اپنے لیے کم رکھتی ہیں یا اپنے لیے رکھتی ہی نہیں۔ یہ ان کی عادات میں شامل ہوجاتا ہے کہ میوہ جات اور پھل وغیرہ کی عورت کو ضرورت نہیں ہے اور وہ اپنے کھانے پر توجہ نہیں دے پاتی ہیں۔

آیئے اس مرض کے بارے میں مزید سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انیمیا جسم میں ہیموگلوبین کی کمی سے ہوتا ہے۔ ہمارے جسم میں دو طرح کے سیلز ہوتے ہیں۔ ریڈ بلڈ سیلز اور وائٹ بلڈ سیلز۔

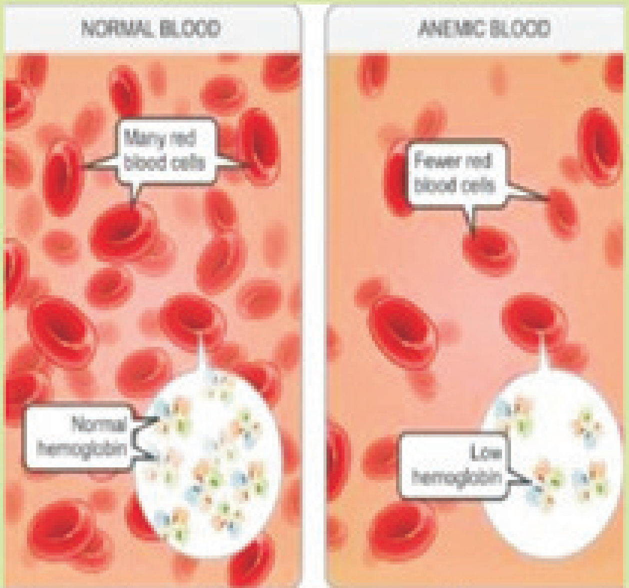

ریڈ بلڈ سیلز یعنی آر بی سی، سرخ ذرات کی کمی ہونے کو ہی انیمیا کہا جاتا ہے۔ آر بی سی ہی جسم میں آکسیجن پہنچاتا ہے اور اس کی کمی سے ہی جسم میں آکسیجن کی بھی کمی ہونے لگتی ہے۔ HB لیول کم ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے پورے جسم کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ خون کے سرخ ذرات ہڈیوں کے گودے میں بنتے ہیں جو جسم کی بڑی ہڈیوں میں موجود رہتا ہے۔ بون میرو میں خون کے سرخ ذرات تیار ہونے میں وائٹامن بی 12 ، آئرن اور فولیٹ کے ساتھ ساتھ دیگر غذائی اشیا مدد کرتی ہیں۔ جب یہ سرخ ذرات کم ہوجاتے ہیں تو انیمیا کا مرض لاحق ہوجاتا ہے۔ اس کی وجوہات کئی ہوسکتی ہیں۔ زیادہ مقدار میں خون کا بہنا (چاہے وہ ماہواری کی شکل میں ہو یا کسی اور وجہ سے ہو) چوٹ لگنا، حمل کی وجہ سے بھی خون کی کمی ہوسکتی ہے۔ یہی نہیں کبھی کبھی پیٹ میں کیڑے بھی خون کی کمی کا سبب بنتے ہیں۔ طویل عرصے تک رہنے والی بیماری سے بھی انیمیا ہوسکتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی وجوہات ہوسکتی ہیں۔

انیمیا کئی طرح کا ہوتا ہے۔ غذا کی کمی سے ہونے والا انیمیا، آئرن اور وائٹامن کی کمی سے ہونے والا انیمیا، کسی بیماری کی وجہ سے ہونے والا انیمیا۔ اگر انیمیا کا علاج وقت پر نہیں ہوا تو جسم کے مختلف حصوں پر اس کا اثر ہوسکتا ہے۔ مثلاً دل، جگر، گردے وغیرہ متاثر ہوسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ جسم کی امراض سے لڑنے کی طاقت (Immune) سسٹم بھی کمزور ہوجاتا ہے جس سے دیگر امراض بھی جسم میں گھر سکتے ہیں۔ ان ساری علامات کے لیے سب سے پہلے تو اچھے ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے اور ساتھ ہی اپنا اچھی طرح خیال رکھنا چاہئے۔ کھانے پینے پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

آئرن اور وائٹامن کی گولیوں کے ساتھ ساتھ ہری سبزیوں کا استعمال ضروری ہے۔ چقندر، گاجر، ٹماٹر، مولی ، پتہ گوبھی، لال ساگ، انار، انگور، سنترہ، پپیتا، کیلا، سویابین، دالیں، ڈیری مصنوعات اور گوشت وغیرہ کو کھانے میں شامل کرنا چاہئے۔ چائے کافی سے پرہیز کرنا چاہئے۔ بازار کے کھانوں اور جنک فوڈ سے بھی مکمل پرہیز کرنا چاہئے۔

ایک بات جو بطور ڈاکٹر میں نے محسوس کی ہے کہ خواتین ورزش سے دور بھاگتی ہیں اور اپنے جسم پر چہرے کے علاوہ زیادہ توجہ نہیں دیتی ہیں جبکہ گھریلو خواتین کے لیے ورزش زیادہ ضروری ہے کہ وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے سستی کا شکار ہوجاتی ہیں اور ان کا جسم آرام طلب ہوجاتا ہے جس سے جسم کا سسٹم پوری طرح کام نہیں کرپاتا۔ اگر گھریلو خواتین بھی کچھ وقت ورزش کو دے دیں تو ان کے جسم میں آکسیجن کا سرکولیشن درست ڈھنگ سے ہونے لگے گا اور وہ مختلف بیماریوں سے بھی بچ جائیں گی۔ آکسیجن جسم میں سرخ خلیات کو بنانے میں معاون ہوتے ہیں۔ یوگا کے ساتھ انار کے جوس کے استعمال سے بھی خون کی کمی پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

Dr. Zarreen Haleem
Haleem Health Care Hospital
Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar
New Delhi-110025

چہرے کی چربی کم کرنے کے آسان طریقے

چہرے کی چربی کم کرنے کے آسان طریقے

اکثر لوگوں کا وزن تو کم ہو جاتا ہے لیکن چہرہ بھاری رہتا ہے۔ وزن کم کرنے کے بعد چہرے کا وزن زیادہ ہونا اچھا نہیں لگتا۔ نازک نقش چہرے کو خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ جسم کے کسی مخصوص حصے سے وزن کم کرنا عموماً پورے جسم کے ایک ساتھ وزن کم کرنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ لیکن چہرے کی چربی کم کرنا اتنا بھی دشوار نہیں کیونکہ چہرہ پتلا کرنے کے لیے پورے جسم پر ہی کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض اوقات چہرے پر تھکاوٹ یا کسی غذا کے استعمال سے وقتی طور پر سوجن آجاتی ہے۔ یہ سوجن خصوصاً صبح اٹھ کر زیادہ نمایاں ہوتی ہے جو خود ہی تھوڑی دیر بعد کم بھی ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر چہرے کا وزن کم کرنا ہو یا چربی کم کرنی ہو تو مندرجہ ذیل طریقوں پر عمل کر کے دیکھیں:

1۔ چہرے کی ورزش کریں

- آنکھوں کو پھیلائیں اور کسی جگہ کو غور سے دیکھیں۔ اپنے چہرے کو اسی حالت میں دس سیکنڈز کے لیے رکھیں پھر ریلیکس ہو جائیں۔ اس عمل کو پانچ بار دہرائیں۔
- فش فیس بنائیں۔ گالوں کو اندر کی طرف کھینچیں۔ اس ورزش کو بھی ایک بار میں پانچ بار کریں۔
- لمبی سانس کھینچیں اور ہونٹوں کو بھینچ لیں۔ اب ہوا کو دائیں اور بائیں جانب دھکیلیے۔ اسے پانچ منٹ تک جاری رکھیں۔
- اوپر کی طرف دیکھیں اور زور سے سانس باہر نکالیں۔ یہ گالوں کی ہڈی کو خوبصورت بنانے کے لیے ایک اچھی ورزش ہے۔
- سب سے بہترین ورزش مسکرانا ہے۔ آپ جتنا مسکرائیں گے چہرہ اتنا ہی شیپ میں رہے گا۔

2۔ پانی کا زیادہ استعمال

پانی چربی گھلانے کے لیے بہترین غذا ہے۔ پانی وافر مقدار میں پینے سے نہ صرف وزن کم ہوتا ہے بلکہ انسان کئی اقسام کی بیماریوں سے بھی محفوظ رہتا ہے۔ پانی سے جلد صاف ستھری اور جسم فاضل مادوں سے پاک رہتا ہے۔

3۔ صحت مند غذا کا استعمال

اگر آپ چہرے کی چربی کم کرنا چاہتے ہیں تو صحیح غذا کا استعمال بہت ضروری ہے۔ اس سے آپ کے جسم کو ضروری غذائیت اور توانائی بھی مہیا ہوتی رہتی ہے۔ اپنی خوراک میں سبزیوں اور پھلوں کا استعمال بڑھائیں۔ کھانا ہمیشہ وقت پر کھائیں۔ رات کو دیر میں کھانا کھانے سے وہ صحیح طرح ہضم نہیں ہو پاتا جو کہ چہرے پر سوجن کا باعث بنتا ہے۔ کیلشیم اور فائبر سے بھرپور غذا لیں۔

خواتین کا مسلسل بیٹھے رہنا انہیں تیزی سے بڑھاپے کی طرف لے جاتا ہے، ماہرین

امریکی ماہرین نے انکشاف کیا ہے کہ اگر آپ زیادہ دیر تک بیٹھے رہنے کی عادت میں مبتلا ہیں تو آپ اتنی ہی تیزی سے بڑھاپے کا شکار بھی ہوں گی۔

1500 خواتین پر کیے گئے مطالعے سے معلوم ہوا کہ جو خواتین زیادہ آرام پسند ہوتی ہیں وہ اندرونی طور پر اپنی اصل عمر کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بوڑھی ہوتی ہیں جبکہ خود کو کام کاج میں مصروف رکھنے اور ورزش کرتی رہنے والی عورتوں پر عمر رسیدگی کے اثرات نسبتاً کم مرتب ہوتے ہیں۔

یونیورسٹی آف کیلیفورنیا کے سان ڈیاگو اسکول آف میڈیسن میں الہ دین شادیاب اور ان کے ساتھیوں نے دریافت کیا کہ حرکت اور ورزش کی بدولت نہ صرف بڑھاپا بلکہ عمر رسیدگی سے وابستہ بیماریاں بھی کم ہوتی ہیں۔

عمر رسیدگی میں ''ٹیلومرز'' کہلانے والے سالمات کا اہم کردار ہوتا ہے جو کروموسومز کے کناروں پر ڈھکنوں کی طرح چڑھے ہوتے ہیں جب کہ کم عمری اور جوانی میں ان کی لمبائی خاصی زیادہ ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ہماری عمر بڑھتی ہے ویسے ویسے ٹیلومرز کی لمبائی بھی کم ہوتی چلی جاتی ہے اور بڑھاپے میں یہ بہت ہی چھوٹے رہ جاتے ہیں۔

''امریکن جرنل اور ایپی ڈیمیولوجی'' کے تازہ شمارے میں آن لائن شائع شدہ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ وہ عورتیں جو دن میں 10 گھنٹے یا اس سے زیادہ دیر تک بیٹھی رہتی ہیں اور روزانہ 40 منٹ سے کم وقت کے لئے حرکت یا ورزش کرتی ہیں، ان میں ٹیلومرز کی لمبائی کم ہونے کی رفتار بھی متحرک اور سرگرم خواتین کی نسبت تیز ہوتی ہے؛ یعنی وہ اپنی اصل عمر کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بوڑھی ہوتی ہیں۔

اس دریافت کی روشنی میں ماہرین کا کہنا ہے کہ خواتین میں ممکنہ طور پر تیزی سے عمر رسیدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک خاص عمر کے بعد زیادہ حرکت کرنا چھوڑ دیتی ہیں اور آرام کو کام پر زیادہ ترجیح دینے لگتی ہیں۔

اس کے بجائے بہتر اور زیادہ جسمانی سرگرمی پر مشتمل معمولات اختیار کر کے وہ نہ صرف بڑھاپے سے بچ سکتی ہیں بلکہ درجنوں امراض سے بھی محفوظ رہ سکتی ہیں۔

حاملہ خواتین کو کبھی بھی اس طرح پانی نہیں پینا چاہیے

سائنسدانوں نے سخت ترین وارننگ جاری کردی، وہ بات جو تمام ہونے والے والدین کو ہر قیمت پر معلوم ہونی چاہیے

کیلگری (نیوز ڈیسک) پانی زندگی کا لازمی جزو اور صحت بخش مشروب ہے لیکن اگر آپ اسے پلاسٹک کی بوتل سے پیتے ہیں تو یہ فائدے سے زیادہ نقصان کر سکتا ہے۔ پلاسٹک کی بوتل میں پایا جانے والا کیمیکل بسفینول اے (بی پی اے) صحت کے لئے نقصان دہ ہے اور خصوصاً حاملہ خواتین کے لئے تو اس کی معمولی سی مقدار بھی بے حد نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

ٹائمز آف انڈیا کے مطابق کینیڈا کی یونیورسٹی آف کیلگری کی سائنسدان ڈیبرا کراش اور ان کی ٹیم نے بی پی اے کے انسانی صحت پر اثرات کے مطالعے کے دوران معلوم کیا ہے کہ حاملہ خواتین کا پلاسٹک کی بوتل سے پانی پینا ان کے بچے کے لئے ناقابل تلافی نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔ اس کا سب سے خطرناک پہلو بچے کے دماغ کو پہنچنے والے نقصان کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ دوران حمل جو خواتین پلاسٹک کی بوتل سے پانی پیتی ہیں ان کے بچوں کا دماغ متاثر ہونے سے وہ طرح طرح کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ بی پی اے کی وجہ سے دماغ کے عصبی ڈھانچے کو پہنچنے والا نقصان عموماً مستقل نوعیت کا ہوتا ہے اور اسے ادویات یا دیگر کسی علاج سے ٹھیک کرنے کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ڈیبرا کی یہ تحقیق شکاگو میں منعقد ہونے والی اینڈوکرائن سوسائٹی کی 100 ویں سالانہ میٹنگ میں پیش کی جائے گی۔

تاثرات: نگر نگر سے

فروری 2018 کا ماہنامہ 'خواتین دنیا' اپنے آب وتاب کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ دلکش اور جاذب نظر سرورق اور پراز معلومات خواتین کے نئے گوشے قارئین کی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ نوازی سے ہی آنکھیں کاغذ اور............کی برتری کی تصدیق کر لیتی ہیں۔

رسالہ موصول ہونے کے بعد اسے............ختم ہونے پر ہی دم لیتا ہوں۔ خواتین، عورت کی سچی تصاویر پیش کر رہی ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار بے باکی کے ساتھ کر رہی ہیں۔ معروف خواتین کے بارے میں نئی نئی معلومات اور نئے گوشے منظر عام پر آ رہے ہیں۔ سبھی قلمکار مبارکباد کے مستحق ہیں اور ادارہ بھی قابل مبارک باد ہے۔ قلمکاروں کے موبائل نمبر تحریر......تو بہتر ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

خواتین دنیا کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ سرورق دیدہ زیب ہونے کے ساتھ دعوت فکر بھی دیتا ہے۔ مضامین کا انتخاب عمدہ ہے۔ طباعت اور پیش کش اعلیٰ ہے۔ سب سے توجہ طلب بات یہ ہے کہ فرہنگ آصفیہ سے گوشوں کو مزین کر کے ایک اچھی پیش رفت کی گئی ہے۔ جو قابل مبارکباد ہے۔ یقیناً یہ ذمہ داران کی اصابتِ فکر اور صلابتِ قلب کا ترجمان ہے۔ ایک سعی مشکور ہے جو فکری ترسیل کی راہوں کو ہموار کرنے اور ذہنی تشکیل کے ابواب وا کرنے میں قابل قدر ثابت ہوگی۔ اور یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایسی ہنر کاری جس سے گلاب کے پھول اپنی جھاڑیوں کے بجائے گل دان میں زیادہ رنگین زیادہ روشن اور جاندار لگتے ہیں۔

جویریہ قاضی، ہیڈ مسٹریس، مومن گرلز ہائی اسکول، بھیونڈی

خواتین دنیا کا رنگین، باتصویر، دیدہ زیب اور تمام صحافیانہ خوبیوں سے مملو شمارہ نظر سے گزرا۔ صحافت کی دنیا میں ایسا خوبصورت ماہنامہ اور وہ بھی خواتین کے لیے مخصوص رسالہ میری معلومات کی حد تک نظر نہیں آتا۔ اس کی جملہ خوبیوں میں سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ رسالہ خواتین کے مختلف موضوعات اور مختلف دلچسپیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ زیادہ تعداد خواتین قلم کاروں کی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خواتین کو آئینی اور قانونی معلومات سے بھی آراستہ کرنے والا ماہنامہ خواتین دنیا، نئے لکھنے والوں کو پرموٹ کرتا ہے۔ سرورق سے لے کر تاثرات تک ہر ہر صفحہ اپنی انفرادیت کی چھاپ چھوڑتا ہے۔ مذکورہ شمارے میں مضامین، کہانیاں، نثر پارے، منظومات، غذا سازی اور حسن و آرائش سب کے سب ایسے ہیں جن کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

قومی کونسل کے ڈائرکٹر اور تمام ذمہ داران کو میری طرف سے ڈھیروں مبارک باد لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی گزارش ہے کہ اس کی تقسیم کے نظم کو درست کیا جائے اکثر خواتین دنیا بہت تاخیر سے آتا ہے اور کبھی کبھی غائب بھی ہو جاتا ہے۔

ثمینہ شبنم، احمد آباد، گجرات

خواتین دنیا کا تازہ شمارہ 'یوم خواتین' کا جشن مناتا نظر آیا۔ لیکن اندر کے صفحات پر یوم خواتین سے متعلق کوئی مضمون نظر آنے سے تعجب ہوا۔ حالانکہ جو مضامین شامل کیے گئے ہیں وہ سب بہت قیمتی معلومات کا خزانہ ہیں جیسے نصرت مہدی کا انٹرویو، جنگ آزادی پر دو مضامین بہت اچھے ہیں لیکن اگر عالمی یوم خواتین پر بھی الگ سے کوئی تحریر ہوتی تو رسالے کے معیار میں چار چاند لگ جاتے۔

بچوں کے ادب پر سید اسرار الحق کا مضمون اچھا تو لگا لیکن بہت زیادہ متاثر نہیں کر سکا اسے مزید وقیع کیے جانے کی ضرورت تھی۔ خواتین شاعرات کے منتخب اشعار بہت اثر انگیز لگے گذارش ہے کہ پرانی شاعرات

کے اشعار بھی شامل کیے جائیں تو بہت اچھا رہے گا۔ اس زمانے میں شاعرات کی شاعری آج سے کتنی مختلف ہوگی اس کا بھی اندازہ ہوگا اور نئی لکھنے والیوں کو نئی راہیں بھی ملیں گی۔ اسی کے ساتھ پرانی افسانہ نگاروں جیسے عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر وغیرہ کی منتخب تحریروں کو بھی شامل کیا جائے۔ اس طرح یہ رسالہ نئے پرانے چراغوں سے روشن وتابناک ہو جائے گا۔

روشن آرا، دھنباد (جھارکھنڈ)

گذشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی فقید المثال اور عدیم النظیر لگا۔ شاید بھارت میں کوئی خواتین کا ماہنامہ نہیں جو اس کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔ اس بار لالی چودھری، احساس نایاب اور سیدہ تبسم منظور ناڈکر کے افسانوں نے بہت متاثر کیا سیدہ شانِ معراج کی غزل بہت پسند آئی۔ ان کے علاوہ صغرا مہدی پر کہکشاں یاسمین کا مضمون 'ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی' عنوان سے درخشاں تاجور اور سیدہ جعفر کی تحریریں بھی بہت معلومات افزا تھیں۔ مستقل کالم کا معیار پہلے سے بلند نظر آیا البتہ سہواً کچھ پروف کی غلطیاں رہ گئیں جو آخر تک کھلتی رہیں۔ سرورق پر جو تخلیقی ہنرمندی پیش کی گئی ہے، سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ رسالہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے اور اردو دنیا کی خواتین میں نیا جوش وِلولہ پیدا کرتا رہے۔ آمین

آمنہ پروین، بھوپال، مدھیہ پردیش

'خواتین دنیا' شاید ایسا پہلا ماہنامہ ہے جو ایک طرف خواتین کی سوچوں کے دروازے کھولتا ہے اور دوسری طرف اردو کا بین الاقوامی معیار پیش کرتا ہے۔ کئی مہینوں سے 'خواتین دنیا' میرے مطالعے میں ہے، ایک بار پڑھ کر جی نہیں بھرتا، ایک ہی رسالے کو بار بار پڑھتی ہوں اور ہر بار کیف وسرور حاصل کرتی ہوں۔ مجھے خواتین دنیا کے مستقل کالم بہت زیادہ پسند ہیں، موسم کے مطابق آرائش و زیبائش اور کھانا بنانے کی تراکیب بہت متاثر کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ خواتین کی لکھی کہانیاں اور مضامین بہت چاہت سے پڑھتی ہوں۔ یوں مکمل رسالہ اپنا جواب آپ ہے لیکن کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ آپ کو مشورہ دوں کہ نوجوان خواتین بالخصوص وہ طالبات جو امتحانات میں اول رہتی ہوں یا جو تمام پریشانیوں اور مصائب سے جوجھتے ہوئے حیرت انگیز طریقے سے آگے بڑھ جاتی ہیں، کے انٹرویو اور حالات زندگی پر مبنی مضامین کی اشاعت کی جائے۔ نئی شاعرات اور کہانی لکھنے والوں کی زندگی کے بارے میں بھی اگر دس بیس لائن لکھ دی جائیں تو بہت اچھا رہے گا۔ امید ہے میرے مشورے پر گو کہ لائق توجہ نہیں مگر غور کیا جائے گا۔ شکریہ

فرحت انصاری، اوبرا، ضلع سون بھدر (یوپی)

قومی اردو کونسل کا انقلابی مجلہ ماہنامہ 'خواتین دنیا' کی دوسری جلد کا تیسرا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ پہلی نظر میں اس رسالے نے من موہ لیا۔ دیدہ زیب طباعت، خوبصورت اور خوب سیرت سر ورق جو خلاقانہ مہارت و ذہانت کا آئینہ دار ہے، تمام صفحات رنگوں کا سنگم اور اس میں شامل مترنم، متبسم، تخلیقات کا سرگم، ساری تحریر میں ایک خاص نظم وضبط کا پتہ دیتی ہیں۔ کل ملا کر یہ رسالہ خواتین کے لیے ایک ایسا تحفہ ہے جو بے نظیر ہے۔ میری طرف سے کونسل کے ارباب حل وعقد کو دل کی گہرائی سے مبارک باد۔

ماہنامہ خواتین دنیا کے مذکورہ شمارے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ تخلیقات کی اکثریت خواتین کے ذریعہ لکھی گئی تحریروں پر مبنی ہے۔ مرد حضرات کو اس میں کم جگہ دی گئی ہے۔ یہ رسالہ ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ خدا کرے اس کا موجودہ معیار ہمیشہ قائم رہے اور اسے کسی کی نظر نہ لگے۔

نائلہ شبینہ، بڑودہ، گجرات

خواتین کے لیے جاری قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ماہنامہ خواتین دنیا کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ پہلی ہی نظر میں رسالے کی جملہ خوبیاں اجاگر ہو گئیں۔ اداریہ پڑھ کر کونسل کے مخلصانہ جذبات اور خواتین کو طاقت ور بنانے کی سرکاری پالیسی کا انکشاف ہوا۔ میں بہت زیادہ اردو ادب سے واقف نہیں ہوں لیکن تمام کہانیوں نے مجھے متاثر کیا، مضامین بہت اچھے لگے، غزلوں میں کافی تعمق اور گیرائی تھی، خواتین کی دلچسپیوں والے گھریلو کالم بھی پسند آئے۔ ان سب سے الگ خواجہ عبدالمنتقم صاحب نے جو خواتین کے آئینی اور قانونی حقوق سے متعلق مضمون لکھا وہ بہت کارآمد ہے۔ عموماً خواتین خود پر ہونے والے جبر وظلم کو خاموشی سے جھیلتی رہتی ہیں۔ اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے بھی ڈرتی ہیں اسی کمزوری کا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ 'قانون میں خواتین' میں جو دفعات ہیں اگر سبھی عورتوں کو علم ہو جائے تو مردوں کی من مانی کافور ہو جائے گی۔ خواجہ صاحب کو میری طرف سے ڈھیروں مبارک باد اور آپ کو، آپ کے تمام اسٹاف کو حکومت ہند کی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کو تمام خواتین کی جانب سے دلی مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ امید ہے کہ ماہنامہ خواتین دنیا اپنے موجودہ معیار کو مزید نکھارنے کی کوششیں جاری رکھے گا۔

شبنم حیات، آرام باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

مغرب میں تنقید کی روایت

مصنف: عتیق اللہ
صفحات: 568
قیمت: 245 روپے

بہار کی بہار (جلد دوم)

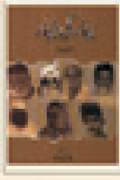

مصنف: اعجاز علی ارشد
صفحات: 242
قیمت: 150 روپے

بہار گلشن کشمیر (جلد اوّل و دوم)

مرتبہ و مؤلف: پنڈت برج کشن کول
و پنڈت جگت موہن ناتھ رینہ
صفحات: 454، 537
قیمت: 275، 300 روپے

دیوندر ستیارتھی

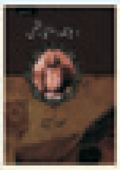

مصنف: عبدالسمیع
صفحات: 162
قیمت: 90 روپے

رشید حسن خاں

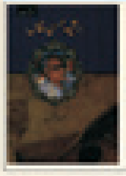

مصنف: عبدالمجید
صفحات: 122
قیمت: 74 روپے

سید امتیاز علی تاج

مصنف: محمد شاہد حسین
صفحات: 136
قیمت: 80 روپے

علی سردار جعفری

مصنف: عمر رضا
صفحات: 165
قیمت: 90 روپے

یاس یگانہ چنگیزی

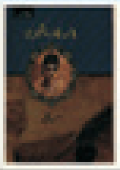

مصنف: حسن مثنیٰ
صفحات: 149
قیمت: 90 روپے

کلیات مضامین وحید اختر (جلد ششم)

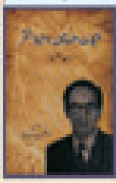

مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 216
قیمت: -/115 روپے

آئینہ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد پنجم: رپورتاژ)

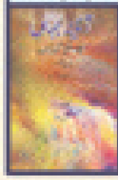

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 407
قیمت: 182 روپے

آئینہ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد ہفتم: مضامین)

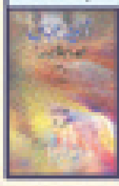

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 359
قیمت: 165 روپے

عظیم سائنسداں (مع ترمیم و اضافہ)

مصنف: اسرار حسین
صفحات: 121
قیمت: -/32 روپے

اسرار کشف صوفیہ 1068ھ مطابق 1658ء)

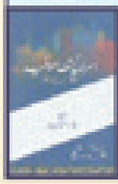

مصنف: سید محمد کمال سنبھلی واسطی
تدوین و تصحیح متن و ترجمہ
و حواشی: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
صفحات: 803، قیمت: -/335 روپے

انتخاب سخن (جلد اوّل) سلسلۂ شاہ حاتم

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 388
قیمت: -/175 روپے

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

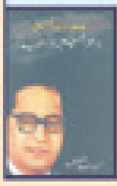

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 155
قیمت: 70 روپے

داستان گو آیا ہے

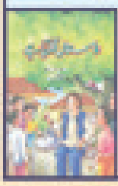

مصنف: رتن سنگھ، مصور: فجر الدین
صفحات: 16
قیمت: 25 روپے

ہماری قلم

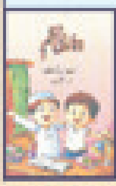

مصنف: فراغ روہوی
مصور: فجر الدین
صفحات: 20، قیمت: 30 روپے

دوسرا آدمی

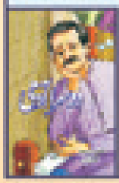

مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly April 2018, Vol. 02, Issue: 4 **RNI. No. DELURD/2017/74026**

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

एक भारत श्रेष्ठ भारत

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025